سلسلہ اشاعت امامیہ مشن عـ ۸۰

رہنمائے ذاکری

مصنفہ

آیۃ اللہ العظمیٰ العلامہ سید علی نقی طاب ثراہ

امامیہ مشن علی گڑھ

سلسلہ اشاعت امامیہ مشن نمبر ۸۰۳

رہنمائے ذاکری

مصنفہ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی طاب ثراہ

امامیہ مشن علی گڑھ

ذاکری کی پہلی کتاب

حصہ اوّل

مصنفہ

حضرت سید العلماء علامہ سید علی نقی صاحب قبلہ مجتہد العصر دام ظلہ العالی

اس کتاب میں مختصر پڑھنے والے ذاکرین کیلئے مختصر مسودے
عشرۂ محرم کی تاریخوں کے لحاظ سے درج کیے گئے ہیں

تمہیدی مضامین اور ربط مصائب لاجواب ہیں

(تیسرا ایڈیشن)

تعارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرکار آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء الحاج سید علی نقی طاب ثراہ نے مرکز اصلاح کی درخواست پر ذاکرین کی رہنمائی کے لئے مختلف سطح کے ذاکرین کا خیال فرماتے ہوئے مجالس عزاء کے مسودہ ۱۳۵۸ھ سے تیار کرنا شروع کر دیئے تھے جن کا سلسلہ ۱۳۹۲ھ تک مکمل ہوا۔ اس طرح چار عشروں کیلئے مواد فراہم ہوگیا۔ دو عشرہ محرم کے اور دو عشرہ اربعین کے۔

پہلی مرتبہ مرکز اصلاح لکھنؤ سے ذاکری کی پہلی کتاب حصہ اول ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ میں طبع ہوئی جسمیں دس مجالس عشرہ محرم کی بلندی ذاکرین کیلئے ہیں۔ نظر ثانی کے بعد اسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن محرم ۱۳۵۹ھ اور تیسرا ایڈیشن جمادی الاول ۱۳۶۲ھ میں طبع ہوا۔ اس کے بعد مجاہد ملت سید ابن حسین صاحب نقوی مرحوم سابق سکریٹری امامیہ مشن کے اہتمام میں یہ کتاب امامیہ مشن سے بھی شائع ہوئی اور آخری بار سید محمد عالم صاحب نقوی جوائنٹ سکریٹری امامیہ مشن کے اہتمام میں محرم ۱۴۰۹ھ میں پھر شائع کی گئی۔

ذاکری کی پہلی کتاب دوسرا حصہ جو عشرہ اربعین کے دس مختصر مسودوں پر مشتمل ہے۔ پہلی بار مرکز اصلاح لکھنؤ سے محرم ۱۳۵۹ھ میں دوسری بار شوال ۱۳۶۲ھ اور اسکے بعد امامیہ مشن سے مجاہد ملت سید ابن حسین صاحب نقوی کے اہتمام میں طبع ہوئی۔

ذاکری کی دوسری کتاب حصہ اول جو نسبتاً بسیط مضامین کی محرم کے عشرہ کی دس مجالس پر مشتمل کتاب ہے، پہلی بار مرکز اصلاح لکھنؤ سے ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ میں اور دوسری بار مجاہد ملت سید ابن حسین صاحب نقوی کے اہتمام میں امامیہ مشن

سے ۱۳۹۰ھ میں طبع ہو کر شائع ہوئی۔ ذاکری کی دوسری کتاب حصہ دوم امامیہ مشن سے ۱۳۹۶ھ میں مجاہد ملت سید ابن حسین صاحب نقوی مرحوم نے طبع کرائی۔

چونکہ فی الوقت یہ کتابیں نایاب ہو چکی ہیں لہٰذا جناب الحاج ڈاکٹر سید سجاد رضا صاحب نائب صدر امامیہ مشن نے تجویز رکھی کہ وہ اپنے والد مرحوم ڈاکٹر سید محب رضا صاحب کے ایصال ثواب کی غرض سے ان کتابوں کی مشن کے ذریعہ طباعت کے اخراجات خود برداشت کریں گے۔ چنانچہ موصوف نے اپنی اس تجویز کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ایک بہترین مثال بھی قائم کر دی۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب نے اس کار خیر میں ایک عملی مثال قائم کر دی ہے لہٰذا اور بھی مخیر حضرات سے امید ہے کہ وہ بھی اپنے مرحومین کے ایصال ثواب کے لئے مشن کی مفید اور نایاب کتابوں کی طباعت میں سرمایہ لگا کر مذہب و ملت کی خدمت کے ساتھ اپنے مرحومین کیلئے ایک اعلیٰ تحفہ فراہم کریں گے جو ایک خیر جاری ہوگا اور جب تک یہ قومی سرمایہ رہے گا تب تک ان مرحومین کا نام بھی زندہ رہے گا اور انھیں ثواب بھی پہنچتا رہے گا۔

اب یہ چاروں حصص یکجائی طور پر "رہنمائے ذاکری" کے عنوان سے پیش کئے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ محبان سید الشہداء اس کتاب کا شاندار خیر مقدم کریں گے اور گرمی افادیت کی کما حقہٗ داد دیں گے۔

خادم ملت:۔ سید تفسیر الحسن نقوی آنریری جنرل سکریٹری امامیہ مشن علی گڑھ۔

۴ شوال المکرم ۱۴۱۰ھ مطابق ۳۰ اپریل ۱۹۹۰ء

محسن قوم

ڈاکٹر سید محب رضا صاحب مرحوم

ولادت :- ۱۲؍ستمبر ۱۸۸۰ء بمقام نوگانواں سادات مراد آباد۔

وفات :- ۱۰؍جنوری ۱۹۶۴ء بمقام مرزا پور

ڈاکٹر سید رضا صاحب مرحوم نے ۱۲؍ستمبر ۱۸۸۰ء کو نوگانواں سادات کے ڈاکٹر سید نذر حسین صاحب مرحوم کی آغوش عاطفت میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم نوگانواں ہی میں حاصل کی۔ انگریزی تعلیم کے لئے لکھنؤ تشریف لے گئے جس سے فارغ ہو کر اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قوم وملت کی خدمت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنے لئے میڈیکل کیریر کا انتخاب فرمایا۔ اور اس کی تعلیم کی تکمیل آگرہ میں ہوئی جس کے بعد ۱۹۲۲ء تک یو پی میڈیکل سروس سے متعلق رہے لیکن ۱۹۲۲ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر کے مرزا پور میں پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی اور آخر دم تک اسی شہر میں مسیحائی فرماتے رہے۔

مرزا پور کے نہ صرف شیعی حلقہ میں بلکہ اپنی حذاقت کی بدولت پورے شہر میں ایک ہر دلعزیز طبیب کی حیثیت سے نیک نام رہے۔ آپ کی شگفتہ مزاجی، ایثار و قربانی کا جذبہ اور مہمان نوازی بھی مرزا پور والوں کے لئے ضرب المثل تھی۔

قوم وملت کی خدمت نیز عزاداری سید الشہداء کے فروغ میں، ڈاکٹر محب رضا صاحب مرحوم کی خدمات کو اس خطے کے لوگ عرصہ دراز تک فراموش نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مرزا پور میں جب تعزیہ کی بناء آپ کی ہی

ڈالی ہوئی ہے۔

مومنین سے التماس ہے کہ ڈاکٹر سید محب رضا صاحب مرحوم کو ایک سورۂ فاتحہ سے یاد فرمائیں۔ اور عنداللہ اور عندالرسول ماجور ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ

"ذاکری" اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے تو صرف مصائب سید الشہدا کے تذکرہ کا نام ہے اور اُس کے لیے پرانے ڈھنگ کا ایک سینہ مرثیہ اور قدیم طرز کا غم انگیز نوحہ کافی ہے مگر ذاکری میں ہر زمانہ کے لحاظ سے جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور "حدیث خوانی" میں مصائب کے قبل تمہیدی بیانات کا اضافہ جو ہوا ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ ذاکری کو بکا و ابکا یعنی رونے رُلانے کے مقصد تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اسی کے ساتھ ضمنی طور پر سہی کچھ اور مقاصد حاصل کرنے کا خیال مدنظر رکھا گیا ہے۔ جیسے تبلیغ دین تعلیم مذہب وغیرہ وغیرہ۔ پھر جب ایسا ہے تو کیوں نہ یہ دیکھا جائے کہ موجودہ زمانہ میں کس طرح کی باتوں کی اشاعت کی ہماری مذہبی زندگی کے لیے ضرورت ہے اور کیوں نہ اسی طرح کی چیزیں پیش کی جائیں

پھر ذکر فضائل یا مصائب میں بھی بعض اوقات دانستہ یا نادانستہ

ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے بہت سے سننے والوں کے خیالات پراگندہ ہوتے ہیں اور کبھی اغیار کے مضحکہ کا باعث ہوتا ہے اس کے بھی روک تھام کی ضرورت ہے۔ غلط روایات کے بیان سے عوام کبھی گمراہی اور غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات اُس سے کسی غلط عقیدہ کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے۔
یہ انتہا سے زیادہ قابل افسوس ہے۔

بعض ذاکرین مناظرانہ مضامین ایسے سخت اور درشت الفاظ میں پڑھتے ہیں کہ غیر مذہب کے لوگ انھیں برداشت نہیں کر سکتے۔ یا کم از کم اُن الفاظ کا اچھا اثر نہیں لے سکتے اس کا نتیجہ ہے کہ اُن کی شرکت مجالس میں بالکل بند ہو گئی اور وہ تبلیغ کا مقصد جو ان مجالس عزا کا خاص جوہر تھا رخصت ہو گیا۔

ان وجوہ سے موجودہ زمانہ میں ذاکرین کے لیے حسب ذیل امور کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔
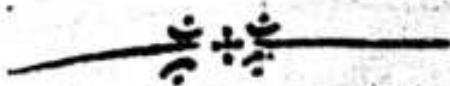
ذاکرین کے لیے ضروری مشورے

(۱) ایسے مضامین کو بیان کریں جن سے عوام کو فرائض کا احساس پیدا ہو اور اعمال کی طرف توجہ ہو اور ایسی روایات بیان کرنے سے پرہیز کیا جائے جن سے یہ شبہہ پیدا ہوتا ہو کہ صرف دعوائے ایمان یا محبت اہلبیتؑ کا اقرار کافی ہے اور واجبات کی پابندی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) موجودہ ضروریات قومی جیسے اتحاد و اتفاق، رواداری اور صلح پسندی، اور تجارت وغیرہ کی طرف بھی توجہ دلائی جائے اور اس کے ساتھ جذبۂ قربانی کو بھی بیدار رکھا جائے۔

(۳) فضائل و مناقب کے تذکرہ کے ساتھ حضرات معصومینؑ کی طرف توجہ دہانی اور ان کے اسوۂ حسنہ کے اتباع و پیروی کی دعوت

(۴) مناظرانہ مضامین میں سخت الفاظ کے استعمال سے پرہیز اور حتی الامکان علمی و استدلالی انداز کا لحاظ۔ اور چونکہ اس پر قدرت صرف قادر الکلام بلند استعداد رکھنے والے واعظین کو ہو سکتی ہے اس لیے

معمولی سطح کے ذاکرین کے لیے ان مضامین ہی سے احتراز بہتر ہے۔

(۵) نقل روایات میں احتیاط سے کام لینا اور جو روایات کسی کتاب میں درج ہوں اُن کے بحوالۂ کتاب بیان کرنے میں اپنی طرف سے کسی قطع و برید یا تصرف سے پرہیز لازم سمجھنا چاہیئے۔

عرصہ سے خیال تھا کہ ان مشوروں کے اُصول کو عملی طور پر سامنے لانے کے لیے ذاکرین کے واسطے ایسے مسودے تیار کر دیئے جائیں جو اُن کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔

الحمد للہ کہ اس سلسلہ کی پہلی قسط میں اس وقت پیش کر رہا ہوں۔

اس حصہ میں بالکل مختصر مسودے درج ہیں جن سے معمولی سطح کے ذاکرین فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ ان مسودوں کو محفوظ کر لیں اور مجالس میں پڑھیں پہلی تاریخ سے روز عاشورا تک ہر دن اُن ہی مصائب کا تذکرہ کریں جو اُن تاریخوں کے لیے مناسب ہیں۔

اس کتاب کے دوسرے حصہ میں مجالس اربعین کے لیے دس مسودے درج کیے جائیں گے، اس کے بعد ذاکری کی دوسری کتاب شایع ہوگی جس میں اسی صورت پر بیس مسودے متوسط درجہ کے ذاکرین کے لیے جو تھوڑا طولانی بیان کے عادی ہیں درج ہونگے۔ اور پھر ذاکری کی تیسری کتاب شایع ہوگی جس میں اعلیٰ واعظین کے معیار کو پیش نظر رکھ کر بسیط مسودے لکھے جائیں گے۔

توفیق اور اعانت خدا کے ہاتھ میں ہے اور اُسی کی بارگاہ میں اس خدمت کی پیشکش ہے۔ تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

تاریخ نظرثانی برائے طبع دوم

۱۱ محرم ۱۳۵۹ھ

نظر ثالث برائے طبع سوم

۲۱ رجب ۱۳۶۲ھ

علی نقی النقوی عفی عنہ

۵ ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلسِ اوّل

محرّم کی پہلی تاریخ

دو امر عظیم است قدرش میاں ولائے علیؑ و بکائے حسینؑ

بیشک یہی دونوں ہماری زندگی کا راز ہیں۔ بحیثیت فضائل و اوصاد اہلبیتِ رسولؐ میں نمایاں ذات امیرالمومنینؑ کی ہے۔ اس لیے اُن کا نام خصوصیت سے لیا گیا ہے۔ اور برداشت مصائب کے لحاظ سے نمایاں شخصیت حضرت سید الشہداء حسین بن علیؑ کی ہے اس لیے آپؑ کا نام پیش کیا گیا۔ مگر ان دونوں باتوں کا اصلی مفہوم ہے اہلبیت کی یاد۔ ہمارے ائمہ معصومینؑ نے اپنے طرزِ عمل سے زندگی کے ہر شعبہ میں ایسی بلند مثالیں پیش کردی ہیں جن کو یاد رکھنا خود ہماری زندگی کے بقا اور تکمیل کا باعث ہے جب ہم انھیں یاد رکھیں گے تو اُن کے فضائل اور بلند اوصاف سے محبت کا پیدا

ہوتا۔ اور اُن کے مصائب سے متاثر ہو کر اشکبار رہنا فطرت کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ مگر اس کا ہماری زندگی پر یہ اثر ہونا چاہیے کہ ہمارے دل میں اُن مصائب کی عظمت پیدا ہو اور ہم اُن کی پیروی کی کوشش کریں۔

خصوصیت سے یہ زمانہ اُن کی یاد کو تازہ کر دیتا ہے محرم کا چاند آسمان پر نمودار ہوتے ہی ایک مظلوم کے مصائب کا تذکرہ دلوں کو بے چین کرنے لگتا ہے۔ وہ مظلوم کون ہے؟ وہ وہی رسولؐ کا فرزند، علیؑ و فاطمہؑ کا لخت جگر حسینؑ! جس نے اپنے نانا کی امت کیلئے اپنا بھرا گھر لٹا دیا۔ وہ حسینؑ جس نے شریعت اسلام کی حفاظت کے لیے اپنی کھیتی تاراج کرلی۔ وہ حسینؑ جس نے مر جانا گوارا کیا مگر ایک فاسق و فاجر کی بیعت گوارا نہیں کی۔ یہ اُن ہی حسین کے ماتم کا زمانہ ہے۔

چاند دیکھتے ہی ہمارا ہر گھر اُن کا عزاخانہ بن گیا۔ زمین پر صف ماتم بچھ گئی۔ اچھی پوشاکیں اور زیب و زینت کے سامان الگ ہو گئے۔ سب سیاہ پوش نظر آتے ہیں۔ عورتوں نے چوڑیاں توڑ ڈالیں، زیور اُتار دیئے اور سوگ رکھ لیا، اُس طرح جیسے والی و وارث کا غم کیا جاتا ہے۔ یقیناً حسین ہمارے دین و دنیا کے بادشاہ تھے اور ہمیں ان کا اسی طرح غم کرنا

چاہئے۔ مگر خدا کرے یہ سب باتیں نمائشی نہ ہوں جس طرح ہماری آنکھوں کے سامنے صف ماتم بچھی ہوئی ہے اسی طرح ہمارے دلوں میں صف ماتم ہونا چاہیے۔ ہم اگر سیاہ پوش ہیں تو اس لباس میں حسن و خوشنمائی اور وضعداری کا خیال نہ کرنا چاہئے۔ ہماری عورتوں نے زیور اتار ڈالے تو سیاہ رنگ کے لچھے کر پھول اور مختلف صورتوں سے آرائش کا خیال ترک کر دینا چاہئے بچوں کو ہم قیدی بناتے ہیں۔ کس کا؟ سید سجاد کے نام کا! تو پھر چاندی سونے کی ہتھکڑی بیڑی سے اپنی دولت مندی کا ثبوت دینے کی ضرورت نہیں ہے وہ ہماری شاہزادیاں تھیں جن کے زیور لوٹ لیے گئے۔ تو ہماری عورتوں کو اس مہینہ میں لٹی ہوئی صورت سے رہنا چاہیئے۔ وہ ہمارے امام تھے جن کے ہاتھوں میں لوہے کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈالی گئی تھیں تو ہمارے بچوں کو بھی یہ زیور لوہے ہی کا پہننا چاہئے۔

یاد رکھئے یہ قیدی بنانے کی رسم ہم میں قربانی کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے یہ دنیا کو دکھلاتی ہے کہ خدا کی راہ میں قید ہونا ہماری عزت کا سبب ہے۔ ہم اس قید ہونے کی منتیں مانتے ہیں اور اس طرح اپنی دلی آرزو کا اظہار کرتے ہیں۔

تعزیہ خانوں کے علم ہم کو یاد دلاتے ہیں کہ ہمارا سب سے بڑا مقدس علم نہر کے کنارے علمدار کے مارے جانے سے گرادیا گیا تھا تو دنیا یہ نہ سمجھ لے کہ وہ علم اب لپست ہو گیا۔ نہیں وہ علم ہمیشہ بلند ہے اور جب تک ہماری جان میں جان باقی ہے اُس علم کو یوہیں بلند رکھیں گے۔

حسینؑ نے کربلا میں حق و باطل کے معرکہ میں بظاہر شکست اٹھائی مگر حقیقتاً فتح حاصل کی اور دائمی فتح۔ اور یزید کو ہمیشہ کے لیے بربادی نصیب ہوئی۔

اس معرکہ کا آغاز اُس وقت سے ہوا جب معاویہ نے دنیا سے انتقال کیا اور یزید تخت سلطنت پر بیٹھا اُس[1] نے ولید بن عتبہ حاکم مدینہ کو خط لکھا کہ امیر شام کا انتقال ہو گیا اور میں تخت خلافت پر بیٹھا ہوں جلد سے جلد ان لوگوں سے بیعت حاصل کرو اور ذرا بھی رعایت نہ کرو۔

اس ذیل میں تین آدمیوں کے نام لکھے تھے جن میں ایک حسینؑ بن علیؑ کی ذات تھی۔ ولید نے امام کو ملاقات کے لیے طلب کیا۔ ابھی تک حسین[2] یکہ و تنہا نہ تھے۔ وہ جب ولید کی ملاقات کو گئے تو جوانان بنی ہاشم ساتھ ساتھ تھے ضرور قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباسؑ اور فرزند جواں علی اکبر شباب کے ولولوں کو

---

[1] مجاہدہ کربلا صفحہ ۱۲ [2] مجاہدہ کربلا صفحہ ۱۴

دل میں لیے ہوئے ہمرکاب ہوں گے امام نے ہدایت فرمائی کہ تم سب دروازہ پر ٹھہرنا میں اندر جاتا ہوں ۔ اگر میں تمہیں بلاؤں یا تم سنو کہ ولید کی آواز بلند ہوئی تو تم سب کے سب اندر چلے آنا ۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو تم سب ٹھہرے رہنا یہاں تک کہ میں واپس آؤں ۔

یاد رکھیے کہ اس وقت ولید کے مکان میں فوج و لشکر نہ تھا ۔ تلواریں کھنچی ہوئی اور تیر چلّوں میں لگے ہوئے نہ تھے ۔ وہاں ایک ولید تھا اور دوسرا مروان ۔ مگر جاں نثاروں کا موجود ہونا عجب چیز ہے ۔

اس موقع پر اگر امام اپنے ساتھ نہ بھی لینا چاہتے تو خود جانباز اس کو گوارا نہ کرتے کہ امام حاکم کی ملاقات کو تنہا جائیں ۔

مگر افسوس عاشور کے دن عصر کے قریب وہ موقع تھا کہ حسینؑ ہزاروں کے لشکر میں یکہ و تنہا تھے ۔ چاروں طرف خون آشام تلواریں تھیں اور درمیان میں ایک اکیلے مظلوم حسینؑ تھے ۔ اس وقت کوئی نہ تھا جو حسینؑ کی حفاظت کے لیے آگے بڑھتا ۔ انصار و اعزا ، بھائی بھتیجے ، بھانجے حسینؑ کے گرد تھے مگر کس طرح ؟ تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے زمین گرم پر ۔ حسینؑ تھے اور بیکسی حسینؑ تھے اور مایوسی ۔ وہ چاروں طرف نظر کرتے تھے مگر سـ

نہ باور ہے نہ عزیز ہے نہ کثرۃ الناس ہے   نہ قاسم ہے نہ علی اکبر ہے نہ عباس ہے

بہر حال ولید[1] سے ملاقات ہوئی۔ اس نے امام کو یزید کا خط پڑھ کر سنایا اور بیعت یزید کا مطالبہ کیا۔ امام نے امیر شام کے انتقال کی خبر سن کر اظہارِ ہمدردی کیا اور سوال بیعت پر مصلحت وقت کے لحاظ سے یہ جواب دیا کہ معاویہ کی وفات کا اعلان کرو اور تمام لوگوں سے یزید کی بیعت لو اس وقت مجھ سے بھی کہنا ولید[2] نے اس کو منظور کیا اور کہا بہتر تشریف لیجائیے۔ مگر مروان نے کہا۔ اے ولید اگر اس وقت حسین تیرے قبضہ سے نکل گئے اور بیعت نہ کی تو پھر ایسا موقع حاصل نہ ہوگا۔ بہتر یہ ہی کہ ابھی ان کو گرفتار کرلے اور یا تو یہ بیعت کریں یا قتل کئے جائیں۔ یہ سننا تھا کہ امام کو غصہ آگیا اور یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ "کیا تمھاری بھی یہ مجال ہے کہ مجھے قتل کرو"

یہ فرما کر آپ باہر نکل آئے۔ اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیت الشرف کی طرف مراجعت فرمائی۔

اس موقع پر اہل حرم کے دلوں کو ضرور اضطراب ہوگا۔ مبارکباد دیجیے

---

[1] مجاہدہ کربلا صفحہ ۱۲   [2] مجاہدہ کربلا صفحہ ۱۲

حضرت زینب کو کہ شاہزادی آج آپ کے بھائی دشمن کے یہاں سے صحیح سلامت واپس آئے۔ مگر آنے والا ہے ایک دن ایسا کہ حسینؑ جو رخصت ہو کر جائیں گے تو خود واپس نہیں آئیں گے۔ اُن کا خالی گھوڑا دروازہ پر آئے گا اس طرح کہ باگیں کٹی ہوئی۔ جا بجا تیر پیوست۔ تمام جسم خوں سے رنگین، زینب خاتون خیمہ سے نکل کر دیکھیں گی تو سرِ حسینؑ نیزہ پر ہو گا۔ چاروں طرف صدا بلند ہو گی اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ اَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْنُ۔

ولید کی ملاقات کے بعد امام نے طے کر لیا کہ اب مدینہ میں قیام مناسب نہیں ہے۔ یہ آپ کے لیے بڑی ناگوار مصیبت تھی۔ ایک تو وطن، اُس پر نانا کا جوار، ماں کی لحد اور بھائی کا مزار۔ ان سب سے علیٰحدہ ہونا امام کو بہت شاق تھا۔ چنانچہ آپ نے اُس شب کو جس کی صبح ہوتے ہوتے آپ مدینہ کے باہر نکل چکے تھے صرف انہی قبروں سے رخصت ہونے کے لیے مخصوص کیا۔

آپؑ نے جدامجد حضرت محمد مصطفیٰؐ کی قبر مطہر سے رخصت ہوئے[۱] اور وہاں آپ کی حالت بہت مضطرب ہوئی۔ چاہنے والے نانا کا زمانہ اور ان کی تمام محبتیں نظروں کے سامنے پھر گئیں اور یہ انقلاب زمانہ کا کہ اُسی نانا

۱؎ مجاہدۂ کربلا صد ۲۹

کے اس سب سے محبوب نواسے سے آج یزید ایسے فاسق و فاجر کی بیعت طلب ہو رہی تھی۔ اور اُس کے واسطے اپنے نانا کے جوار میں رہنے کے لیے زمین تنگ ہو گئی تھی۔

یہ احباب تھے کہ امام کا دل اُمنڈ آیا اور قبر سے مل کر بہت روئے یہاں تک کہ روتے روتے آنکھ لگ گئی۔ خواب میں رسول اللہ کو دیکھا نواسہ نے رو رو کر نانا سے اُمت کا شکوہ کیا۔ اور کہا "اس سے تو بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے اپنی قبر میں لے لیجئے۔ مگر رسولؐ نے حسینؑ کو آیندہ کے مصائب کا مقابلہ کرنے کی بشارت دی۔ حسین بیدار ہوے اور اب وہ بالکل شہادت کے آخری مرحلہ کو سر کرنے کے لیے تیار تھے۔

ابھی رات ختم نہ ہوئی تھی کہ آپ مدینہ سے روانہ ہو گئے مدینہ کے در و دیوار سے آج حسرت ٹپک رہی ہے۔ مدینہ کا حقیقی شہنشاہ رخصت ہو رہا ہے۔ اب حسینؑ اس مدینہ میں واپس نہ ہوں گے نہ اُن کے ساتھ کا کوئی جوان واپس آئے گا۔ ایک علیل و بیمار فرزند اور کچھ لٹی ہوئی بی بیاں آئیں گی۔ وہ بھی اس شان سے کہ

اُن کے چہروں سے مدت کی اسیری کے آثار نمایاں ہوں گے جبھی
اُس موقع پر ام کلثوم کا دل بھر آئے گا۔ وہ کہیں گی ؎

مَدِیْنَۃَ جَدِّنَا لَا تَقْبَلِیْنَا! فَبِالْحَسَرَاتِ وَالْاَحْزَانِ جِیْنَا
خَرَجْنَا مِنْكِ بِالْاَھْلِیْنَ جَمْعًا رَجَعْنَا لَا رِجَالَ وَلَا بَنِیْنَا

"اے ہمارے نانا کے مدینے! اب ہم اس قابل نہیں کہ تجھ میں
آئیں کیونکہ جب تجھ سے گئے تھے تو سروں پر وارثوں کا سایہ تھا
گودیاں بچوں سے آباد تھیں۔ اب اس طرح آئے ہیں کہ مردوں
کو کربلا کے جنگل میں کھو دیا اور گودیاں بچوں سے خالی ہو گئیں۔

ام کلثوم کا مرثیہ

مجلسِ دوم

محرّم کی دوسری تاریخ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ

جناب سرورِ اکرم سید اولادِ آدم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ دونوں جوانانِ اہلِ جنت کے سردار ہیں دیکھنے میں یہ بہت مختصر الفاظ ہیں لیکن وہ اتنے گرانقدر اور بیش قیمت ہیں جن کے مقابلہ میں دنیا کی تمام عزتیں اور عظمتیں ہیچ نظر آتی ہیں رسولؐ نے اپنے دونوں نواسوں کے سر پر ایک تاج رکھ دیا ہے جس کے سامنے حضرت سلیمانؑ کے تخت وتاج کی کوئی وقعت نہیں کیونکہ وہ دنیاوی سلطنت کی شان تھی جو چند روزہ ہے اور یہ ملک آخرت کی ابدی حکومت ہے جس کو زوال نہیں۔

بہشت کے رہنے والوں میں ہر طبقہ اور جماعت اور درجہ کے لوگ ہیں انبیاؑ ومرسلینؑ، صدیقینؑ، شہدا وصالحین، اور کسی کو رسولؐ نے مستثنیٰ نہیں کیا ہے سوائے خود رسولؐ کی ذات کے۔ اس بنا پر گویا ہی شاہزادوں کو اس سلطنت کے

عطا ہونے کا ذریعہ ہیں اس لیے آپ کی افضلیت میں کوئی شبہہ نہیں اور سوئے ان شاہزادوں کے والد بزرگوار امیرالمومنینؑ کے جن کے متعلق خود رسولؐ نے اس حدیث کے آخر میں ان الفاظ کا اضافہ کردیا کہ وَاَبُوْھُمَا خَیْرٌ مِنْھُمَا" اُن کا باپ اُن سے بہتر ہے۔

اور کوئی تیسری شخصیت میری نظر میں نہیں ہے جو شاہزادوں کی سرداری کے دائرہ سے الگ سمجھی جا سکے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی بہشت کے حقدار ہونے ہی سے استعفا دیدے تو اس سرداری کے احاطہ سے بھی نکل جائے گا۔

رسالتمآبؐ نے اس حدیث میں شاہزادوں کی منقبت ہی نہیں بیان کی ہے بلکہ اُن کی امامت کی تصریح کردی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جنت میں جانے کا استحقاق ایمان اور عمل صالح سے پیدا ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں اس کی تصریح بہت کثرت سے موجود ہے۔ تو اہل جنت کون لوگ ہیں؟ وہ جو ایمان اور اعمال صالحہ بجا لائیں۔ حسنؑ اور حسینؑ اہل جنت کے سردار ہیں یعنی اہل جنت وہی ہیں جو اپنے عقائد و اعمال میں ان کی پیروی کریں ان کے پیچھے چلیں یعنی انھیں پیشوا تسلیم کریں اور یاد رکھیے کہ امام وہی ہے جو خدا کی طرف سے پیشوا قرار دیا گیا ہو۔ امامت فوج و رعیت اور تاج و تخت سے

حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ خدا کی طرف سے مفترض الطاعۃ بنا دیئے جانے سے ہوتی ہے۔ امام وہی ہے جس کی اطاعت ہر بات میں خدا کی طرف سے ضروری قرار دی گئی ہو۔

پھر جب حسنؑ اور حسینؑ تمام اہل بہشت کے سردار ہیں اور بہشت کا تعلق ایمان کے بعد انسانی افعال و اعمال سے وابستہ ہے تو اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ حسنینؑ اپنے سیرت و کردار کے لحاظ سے ایک ایسا مکمل نمونہ ہیں جن کے اتباع و پیروی سے مومن کو نجات و بہشت کا استحقاق پیدا ہوتا ہے اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ رسول کے ان دونوں فرزندوں نے دنیائے اسلام میں وہ عملی نمونے پیش کئے ہیں جو صفحۂ تاریخ پر ہمیشہ نہ مٹنے والے حروف میں برقرار رہیں گے یوں تو تمام معصومین کی زندگی اپنے اپنے دور میں قابل اطاعت و اتباع تھی مگر جیسے نمایاں مظاہروں کا موقع ان دونوں بزرگواروں کو ملا ویسا دوسرے حضرات کو نہیں ملا۔ یوں تو دیکھنے میں یہ دو ہستیاں ہیں مگر اُن کی زندگی ایک دوسرے کا تتمہ ہے۔ وہ گویا دو ورق ہیں ایک کتاب اخلاق کے کہ دونوں کا غور کر کے اُن پر عمل کرنا انسانی زندگی کی تکمیل کا باعث ہو سکتا ہے۔

علم اخلاق میں طے پایا ہے کہ انسان کی تمام قوتوں کا معتدل ہونا تمام فضائل کا سنگ بنیاد ہے۔ یہ دنیا والوں کی ناسمجھی ہے کہ وہ ہر اُس شخص کو جو بلا تامل جنگ پر آمادہ ہو جائے بہادر اور شجاع کہتے ہیں، مگر شجاعت حقیقتاً یہ ہے کہ انسان کیلئے جس وقت قدم اٹھانا مناسب ہو اور اقدام ضروری ہو اُس وقت پُر جگری کے ساتھ وہ آگے بڑھے اور وہ سب کچھ کرے جو اُس کا فرض معلوم ہوتا ہو چاہے اس سلسلہ میں اُسے جان بھی نذر کر دینی پڑے اور جس موقع پر اقدام مناسب نہ ہو بلکہ سکوت اور چشم پوشی کی ضرورت ہو اُس وقت تحمل سے کام لے چاہے اس میں کتنی ہی مشکلات درپیش ہوں اور ناگوار صورتوں کا مقابلہ کرنا پڑے۔ اس صورت میں خاموشی اُسی طرح شجاعت کا ثبوت ہوگی جس طرح پہلی صورت میں نبرد آزمائی۔

دنیا والے عموماً ظاہر بیں ہوتے ہیں۔ وہ کسی بات کے اصل اسباب پر غور نہیں کرتے حضرت سید الشہداء نے جس طرح اور جس موقع پر واقعہ کربلا میں اپنی عظیم قربانی پیش کی اُس کی اہمیت و عظمت کا احساس کرنے والے بہت کم ہیں۔ مگر ہر شخص ہر موقع پر واقعہ کربلا کی مثال ضرور پیش کرتا ہے۔ گویا ہر شخص اپنے وقت کا حسینؑ ہے اور ہر موقع اُس کے لیے کربلا ہے مگر دنیا کو معلوم ہونا چاہیے کہ محل کا تقاضا اور اسباب کی صورت مختلف ہوتی ہے۔ وہ شجاعت کا ایک پہلو تھا جسے امام حسینؑ نے

مکمل صورت پر کربلا میں پیش کیا۔ مگر اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جسے حسنؑ نے اپنے زمانہ میں پیش کیا تھا اور حضرت سیدالشہداءؑ نے بھی اُس کی پابندی کی تھی دونوں اماموں کی سیرت نے عالم کے سامنے دونوں صورتیں پیش کر دی ہیں اور مذہبی لحاظ سے ہر ایک اپنے مقام پر درست و صحیح ہے۔

اب یہ شناخت کرنے کی ضرورت ہے کہ کس موقع پر کس امام کے اتباع کا محل ہے اور اسی لیے ہر زمانہ میں علما و مجتہدین کی ضرورت ہے۔ افراد قوم کیلئے صحیح راہِ عمل کی تعیین بغیر ان حضرات کے نہیں ہوسکتی اور یہ ان حضرات کا منصب ہے کہ وہ اپنے علم و بصیرت سے اپنے پیشوایان دین ائمہ معصومینؑ کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے قوم کو صحیح راستہ کی طرف دعوت دیں۔

امام حسنؑ نے اپنے فرض کو انجام دینے کیلئے جن روحانی تکالیف کو برداشت کیا ہے وہ ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ اور دس برس کی طولانی مدت اسی حالت میں گزار دی۔ اس کے بعد امام حسینؑ نے بھی دس برس تک اسی کی پابندی کی۔ اس دوران میں بہت سے تکلیف دہ واقعات پیش آئے مگر امام کے انھیں برداشت کیا۔ بے شک جب معاویہ کے بعد یزید تخت خلافت پر بیٹھا اور اس نے امام کو بیعت کے لیے مجبور کرنا چاہا تو اب امام کو

ضرورت محسوس ہوئی کہ حق و باطل کے آخری مقابلہ کے لیے میدان عمل
میں آ جائیں۔ پھر بھی آپ نے اپنی طرف سے کوئی شورش اور ہنگامہ برپا نہیں کیا
آپ نے مدینے سے ہجرت کی اور حرم خدا میں پناہ لی جہاں جانوروں تک کو ستانے
کی ممانعت ہے مگر افسوس اُس وارث حرم کو حرم میں بھی پناہ نہیں ملی۔
آپ کو خطرہ[1] پیدا ہوا کہ کہیں مکہ معظمہ ہی میں آپ کا خون نہ بہا دیا جائے
وہ شعائر الٰہیہ کی محافظ ہستی تھی جس کو خانۂ خدا کی حرمت اپنی جان
سے زیادہ عزیز معلوم ہوئی۔ امام حسینؑ نے مکہ معظمہ سے بھی ہجرت کی اور کوفہ کا
رُخ کیا۔ مگر ابھی راستہ ہی میں تھے کہ دشمن کی فوج سامنے آتی نظر آئی
یہ پہلی[2] تاریخ محرم کا ذکر ہے۔ جب امام کا قافلہ منزل شراف سے
حدود سے آگے بڑھا ہے۔ ایک شخص نے اصحاب میں سے کہا اللہ اکبر حضرت نے
فرمایا بے شک خدا بزرگ و برتر ہے مگر اس وقت تکبیر کہنے کی وجہ؟
اس نے کہا مجھے خرمے کے درخت دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ لوگ جو اُس مقام
سے واقف تھے اُنھوں نے کہا کہ اس جگہ خرمے کے درخت کہیں نہیں ہیں
ہمیں تو گھوڑوں کی گردنیں نظر آ رہی ہیں۔ امام نے بھی اس خیال کی تصدیق

پہلی محرم کو مقابلہ

۱؎ مجاہدۂ کربلا ص ۳۶
۲؎ مجاہدۂ کربلا ص ۳۹

کی۔فرمایا کہ یہاں کوئی پشت پناہ ایسی ہے جس کو اپنے پس پشت قرار دے کر دشمن سے سامنے کی جانب سے مقابلہ کریں؟

یہ تھا اہل حرم کی حفاظت کا خیال، اسی لیے آپ نے یہاں ایک پہاڑی تلاش کی تاکہ خیمے اُس کے دامن میں لگا دیئے جائیں۔اور دشمن اُس طرف سے حملہ نہ کر سکے۔اور کربلا میں اسی خیال سے خیموں کے گرد خندق کھُدوائی اور اُس میں آگ روشن کرا دی۔

بے شک جب تک حسینؑ زندہ رہے کسی کی مجال نہ ہوئی کہ اہل حرم کے خیموں کا رُخ کر سکے مگر افسوس وسویں محرم عصر کے وقت جب چراغ امامت خاموش ہو گیا تھا تو وہی خیمے تھے اور اُن میں آگ کے شعلے بلند تھے خاندان رسالت کی شاہزادیاں سراسیمہ و مضطرب پھر رہی تھیں اور کوئی پناہ دینے والا نہ تھا۔

غرض ذو حسم پہاڑ قریب تھا آپ اُس طرف متوجہ ہوئے اور فوج مخالف کے پہلے وہاں پہونچ گئے۔خیمے نصب کر دیئے گئے اتنی دیر میں آنیوالی فوج وہاں پہونچ گئی۔یہ حُر بن یزید ریاحی کا رسالہ تھا جس میں ایکہزار آدمی تھے۔یہ سب لوگ افواج ابن زیاد میں سے امام کے

سدِ راہ ہونے کے لیے بھیجے گئے تھے۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت فرزند ساقی کوثر نے اپنی مخالف فوج کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ دشمن کی فوج تھی مگر پیاسی تھی۔ تو حسینؑ سے رہا نہ گیا حضرت نے اپنے جوانوں کو حکم دیا۔

اِسْقُوا الْقَوْمَ وَرَشِّفُوا الْخَیْلَ تَرْشِیْفًا

"ان کو پانی پلاؤ اور تمام فوج کو پورے طور سے سیراب کر دو"

حکم کی دیر تھی۔ اطاعت امام میں کمر بستہ جوان آمادہ ہو گئے اور سب کو سیراب کیا۔ حالت یہ تھی کہ پیالے، لگنین اور طشت پانی سے بھرتے تھے اور اُسے گھوڑے کے پاس لے جاتے تھے جب وہ تین چار دفعہ پی کر منھ ہٹا لیتا تھا تو اُس وقت دوسرے کے پاس لے جاتے تھے یہاں تک کہ سب سیراب ہو گئے۔

علی بن طعان محاربی ناقل ہے کہ میں حر کے لشکر میں سب کے آخر میں تھا اور بہت پیاسا تھا۔ جب حضرت نے میرے گھوڑے کی پیاس کو دیکھا فرمایا:۔

"انخ الرّاویۃ یعنی شتر آب کش کو بٹھاؤ"

میری زبان میں "راویہ" مشک کو کہتے تھے۔ اس لیے میں سمجھا کہ مشک کو بٹھانے کے کیا معنی ہیں۔ حضرت نے فرمایا۔ انخ الجمل یعنی اونٹ کو بٹھا لے"

ہیں نے اونٹ کو بٹھایا۔ حضرت نے فرمایا "بی اب پانی پی" میں اتنا بد حواس تھا کہ جتنا پینے کی کوشش کرتا تھا پانی زمین پہ بہتا اور میں تک پہونچتا تھا۔ اور بہانے سے بھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر حضرت خود بہ نفسِ نفیس اُٹھے اور مشک کے دہانے کو درست کرکے جھکا دیا۔ جس کے بعد میں نے خود پانی پیا۔ اور اپنے گھوڑے کو بھی سیراب کیا۔

یہ تھا حسینؑ کا کرم۔ یہ تھے حسینؑ کے اخلاق۔ یہ تھی حسینؑ کی انسانی ہمدردی اور مواسات۔ یہ تھی حسینؑ کی بلند نظری۔ اور شرافت طبعی۔

ہرگز امام اس پر کسی معاوضہ کے طلبگار نہ تھے۔ مگر کیا انسانیت کا تقاضا یہی تھا کہ امام کو اس کا صلہ روز عاشور کوفہ والوں کی طرف سے یہ دیا جائے کہ نہر پر پہرے بٹھا دیئے جائیں۔ اور حسینؑ اور ان کے تمام ساتھی بلکہ چھوٹے بچے تک پیاس سے تڑپا کریں۔ اور دشمن ایک قطرہ دینے پر رضامند نہ ہوں۔

اسی پانی کے لیے عباسؑ ایسے جوان بھائی کے شانے قلم ہوں۔ علی اکبرؑ پانی مانگتے دنیا سے جائیں اور شش ماہہ بچے کے خشک گلے پر تیر لگے۔ مگر پانی کا ایک قطرہ نصیب نہ ہو۔ محتشم کاشانی نے کیا خوب کہا ہے ؎

بودند دیو و دد ہمہ سیراب و می مکید خاتم ز قحط آب سلیمان کربلا

آواز العطش ز بیابان کربلا
از تشنگان ہنوز بعیوق می رسد

عزاداران حسین! آج دوسری تاریخ محرم کی ہے۔ آج ہی وہ قیامت خیز دن ہے۔ جب ہمارے آقا کربلا کی زمین پر پہونچے اور یہاں اترنے پر مجبور کر دیئے گئے۔

امام نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:۔ اِنْزِلُوا هٰهُنَا مَحَطُّ رِكَابِنَا وَسَفْكُ دِمَائِنَا
"اترو یہیں ہمارے خیمے نصب ہونگے اور یہیں ہمارا خون بہایا جائیں گے"

رونے والو کیا بتاؤں کہ اس زمین پر کیسے کیسے خون بہائے گئے۔ صحاب و انصار کا خون ایک طرف۔ بنی ہاشم کا خون ایک جانب۔ پھر اُن میں بھی حسن مجتبیٰ کے یتیم قاسم و عبداللہ کا خون۔ مظلوم کربلا کے کڑیل جوان علی اکبر کا خون۔ قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباس کے شانوں کا خون۔ اور سب بڑھ کر چھ مہینے کے شیر خوار بچہ کا خون ناحق۔ کچھ تعجب نہ سمجھئے کہ اس لہو کے گرنے سے زمین کربلا تھرانے لگی ہو۔ اور پھر فرزند رسولؐ کے بے شمار زخموں کا خون۔ حلق مطہر کا خون۔

بے شک تمام خون اس زمین پر بہائے گئے۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا

سلہ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مجاہدہ کربلا صفحہ ۸ تا ۸

کہ وہ اس خاک میں جذب ہو گئے۔ نہیں نہیں اس خون کی قدر تو رسولؐ کو تھی۔ جنھوں نے زبان چوسا چوسا کر پرورش کی تھی۔

حضرت اُمّ سلمہ نے روز عاشور کی عصر کو خواب میں رسالتمآبؐ کو دیکھا کہ سر برہنہ ہیں۔ سر و ریش مبارک پر خاک ہے اور ایک شیشہ ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں جس میں خون تازہ جوش کھا رہا ہے۔ اُمّ سلمہ نے پوچھا یا رسول اللہ یہ کیا حالت ہے۔ فرمایا میرا فرزند حسینؑ کربلا کی زمین پر قتل ہو گیا۔ یہ میرے سر پر خاک کربلا ہے اور اس شیشہ میں حسینؑ اور انصار حسینؑ کا خون ہے۔

مجلسِ سوم

محرم کی تیسری تاریخ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ ذِکْرُ عَلِیٍّ عِبَادَۃٌ

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ علیؑ بن ابی طالبؑ کا ذکر عبادت ہے۔

عبادت کے معنی ہیں بندگی۔ وہ عمل جس سے معبود خدائے تعالیٰ کی رضامندی ہو۔ ظاہر ہے کہ خالق اور مخلوق ایک دوسرے سے جدا گانہ ہیں، ایک بندہ کا تذکرہ صرف اس لحاظ سے کہ وہ مخلوق خداوندی ہے بیشک خدا کی عبادت ہو گا لیکن اُس مخلوق کی ذات کا خود کچھ تذکرہ کیجئے تو وہ عبادت خدا ہرگز نہیں قرار پائے گا۔

علیؑ کے ذکر کو بلاتخصیص رسولؐ خدا کی عبادت قرار دے رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ علیؑ ایک ایسا بندہ ہے جس کے اوصاف کے تذکرہ سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ علیؑ کی سیرت اور اُن کے

حالات کے سننے سے بندگی خدا کا ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ عبادت ہے۔

تیسرے اس لئے کہ علی ابن ابیطالب دنیا کے سامنے بلند اخلاق اور بہترین اعمال کا ایک ایسا نمونہ ہیں جس کا مشاہدہ شریعت و تعلیم مذہب کے سمجھنے کا مکمل ذریعہ ہے۔ اس لیے جس طرح تلاوت قرآن عبادت و علم قرآن حاصل کرنا عبادت ہے۔ اس لیے کہ وہ دین الٰہی اور شریعت خداوندی کے لفظی تعلیمات کا مجموعہ ہے اسی طرح علی بن ابی طالب کے حالات کا بیان کرنا اور سننا عبادت ہے اس لیے کہ وہ دین و شریعت کے ان ہی تعلیمات کا عملی مجسمہ ہیں۔ حقیقتاً فضائل امیرالمومنین اور حضرت کے اوصاف کے بیان کرنے کا بہت بڑا مقصد یہی ہے کہ ناواقف لوگ حضرت کے اوصاف و کمالات سے روشناس ہوں اور آپ کے تعلیمات اور سیرت کو دیکھکر آپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

ان فضائل کے تذکرہ سے ہماری تفریح طبع اور محظوظ ہونے کا سامان ہرگز مقصود نہیں ہو سکتا۔ ورنہ اس کے لیے اتنی تاکید نہ کی جاتی۔ ہمارے محظوظ ہونے کے تو اور بھی بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں مگر تذکرہ اہلبیت اور

وسعت علی بن ابی طالب کا مقصد یقیناً اس سے بلند اور بالاتر ہے۔
یہ سمجھنا کہ ائمہ معصومین جو کچھ کر گئے وہ ان کی ذات سے مخصوص تھا،
ہم اُنکی پیروی نہیں کر سکتے بالکل غلط ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن مجید میں
پیغمبرؐ کے اسوۂ حسنہ یعنی اعمال و افعال کا تذکرہ نہ کیا جاتا اور حضرت کے اتباع
یعنی پیروی کی دعوت نہ دی جاتی۔ پھر جب سالتمآبؐ جو معصومینؑ میں
سب سے بلند درجہ رکھتے ہیں اُن کی سیرت ہمارے لیے پیروی کے
لائق ہو سکتی ہے تو دوسرے معصومینؑ کو اس سے علٰحدہ کیسے سمجھا
جا سکتا ہے۔

پھر ہم بالکل اُسی طرح اُتنا ہی ہرگز نہیں کر سکتے اس لیے کہ ہمارے
نفوس اتنے پاکیزہ نہیں ہیں مگر اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ہم بالکل اُن کی
اطاعت و پیروی سے مستثنیٰ ہو جائیں۔

خود امیر المومنین نے جہاں اپنی سیرت کا تذکرہ فرمایا ہے تو یہ کہدیا
ہے: اَلَا اَنَّکُمْ لَا تَقْدِرُوْنَ عَلٰی ذٰلِکَ وَلٰکِنْ اَعِیْنُوْنِیْ بِجُھْدٍ وَّتُقٰی۔
معلوم ہونا چاہیے کہ تم لوگ اس پر قادر نہیں ہو گے جو میں کرتا ہوں مگر
اپنے مقدور بھر میرا ساتھ تو دو۔

ہماری یہ حالت ہو کہ ہم اُن کے فضائل و مناقب سُن کر خوش ہولینے اور درود کے چند نعرے بلند کر دینے ہی کو اپنا آخری فرض سمجھ لیتے ہیں اور یہ دیکھتے ہی نہیں کہ آخر ان حالات میں ہماری تعلیم کے کیا پہلو مضمر ہیں ہم کبھی اپنے حالات پر نظر نہیں ڈالتے کہ ہم میں کوئی بھی بات ایسی ہے جو امیر المومنین کی نگاہ میں پسندیدہ ہو؟

امیر المومنینؑ نے آنکھیں کھولیں رسولؐ کی آغوش میں اور بچپنے سے حضرت کی آغوش میں پرورش پائی۔ تو دس برس کا سن تھا جب رسولؐ مبعوث برسالت ہوئے اُس وقت سے برابر علیؑ کی زندگی صرف ہوئی رسولؐ کی اطاعت، وفاداری، اور جاں نثاری میں۔ اس جاں نثاری کا سب سے بڑا نمونہ وہ تھا جب رسول کو ہجرت کا حکم ہوا اور آپ نے علیؑ کو حکم دیا کہ تم آج کی شب میرے فرش خواب پر آرام کرو۔

علی بن ابی طالب نے خوشی خوشی اس کو منظور کیا۔ رسالتمآبؐ تشریف لے گئے۔ رات کا وقت۔ مکان کے چاروں طرف دشمنوں کی کھنچی ہوئی تلواروں کا محاصرہ اور درمیان میں رسولؐ کے فرش پر اُن کا حقیقی جانشین رسول کی چادر اوڑھے ہوئے اطمینان کی نیند سو رہا تھا۔ اس وفاداری اور جاں نثاری کا

نتیجہ یہ تھا کہ آیت قرآن مدح کرتی ہوئی اُتری وَمِنَ النَّاسِ مَن یَّشْرِی نَفْسَہُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ "دنیا میں ایسے بھی آدمی ہیں جو بیچ ڈالتے ہیں اپنی جان کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے"۔

آیت کے الفاظ میں گنجائش کافی ہے۔ مگر رسالتمآبؐ کے زمانہ میں اس کا نمونہ ایک فرد میں منحصر تھا اور وہ علیؑ بن ابی طالب کی ذات تھی۔ اگر ڈھونڈھیے کہ رسول کا اتنا جاں نثار کوئی اور بھی تھا تو تاریخ جواب نفی میں دے گی۔ تھا کوئی تو بس علیؑ بن ابی طالب۔

مگر علیؑ کی رسولؐ کے ساتھ خصوصیت بھی تو دیکھیے۔ رسول کے چچازاد بھائی، رسولؐ کی آغوش میں پرورش پانے والے۔ وہ اس طرح وفاداری نہ کرتے تو کون کرتا۔ مگر حسینؑ کو کربلا میں ایسے جاں نثار ملے جو ظاہر میں آپ سے کوئی قرابت بھی نہیں رکھتے پھر بھی اُنھوں نے اپنی جان بیچ ڈالی تھی نصرت سیدالشہداء میں بنی ہاشم کا ذکر نہیں ہے وہ تو امام کے عزیز تھے! انصار کا ذکر ہے ہمیں اُن کا تذکرہ سُن کر فقط رو لینا کافی نہیں ہے بلکہ یہ سوچنا بھی چاہیے کہ ہم جو دوستدار حسینؑ ہونے کے مدعی ہیں تو ہم بھی امام حسینؑ کی راہ میں ایسا ہی کر سکتے یا نہیں۔

اُنھوں نے جس استقلال جس ثباتِ قدم اور پُر جگری کے ساتھ اپنی قلت کا لحاظ نہ کرتے ہوئے دشمن کی فوج کے اُس سیلاب کا مقابلہ کیا ہے اُس کی نظیر نہ اُن کے پہلے نظر آئی نہ اُن کے بعد۔ اُن میں سے ہر شخص حسینؑ کے وجود کے سامنے اپنی ہستی کو فنا سمجھتا تھا۔

وہ اپنی حقیقی زندگی یہی سمجھتے تھے کہ حسینؑ کے قدموں پر اپنے تئیں نثار کر دیں۔

یاد کیجئے وہ وقت جب دشمن کی فوج نے یکبارگی تیروں کا حملہ کیا ہے۔ تصور تو کیجئے کم و بیش سو آدمیوں کی مختصر سی صف اور اُس کے سامنے ہزاروں کا بڑا لشکر۔ اور اُس لشکر کی طرف سے مجموعی طور پر ایک ہی نشانہ پر تیر چلیں بس یہ سمجھیے کہ عظیم سیلاب بڑا طوفان اور لوہے کی ایک چادر تھی جو تیروں کی صورت میں ہر طرف سے اس مختصر سی جماعت پر چھا گئی تھی۔ واہ رے انصار سید الشہداءؑ اُنھوں نے اس وقت تلواریں سوت لیں تیروں کے اس طوفان کا اپنے سینوں سے مقابلہ کرتے اور اُس کو ریلتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور فوج دشمن میں گھس کر شمشیر زنی کرنے لگے آخر میں دشمن کو شکست دے کر پسپا کر دیا۔

اس حملہ میں پچاس آدمی انصار سید الشہداءؑ میں سے درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ جنمیں سے بعض تیروں کے نشانہ تھے اور بعض جنگ مغلوبہ میں لڑ کر

شہید ہوئے مگر یہ ان اصحاب کی وفاداری کا بڑا کارنامہ ہے کہ اتنے بڑے حملہ کے باوجود کسی ہاشمی جوان، کسی حسینؑ کے عزیز اور کسی بچہ تک کو کوئی صدمہ نہیں پہونچا نہ کوئی زخم آیا۔ گویا یہ اصحاب اپنے تئیں سپر بنائے ہوئے تھے مگر جب ان باوفا اصحاب میں کوئی نہ رہا تو پھر علیؑ و فاطمہؑ کے دل کے ٹکڑے تھے اور دشمنوں کے تیر، نیزے اور تلواریں۔

علی اکبر کی نوجوانی اور قاسم کی کمسنی پر رحم کیا کرتے چھ مہینہ کے شیرخوار بچہ تک کو نہیں چھوڑا۔ کہاں وہ نازک گلا اور کہاں دشمن کا تیر۔ زمین و آسمان کانپ گئے ہوں گے جب حرملہ نے تیر جلیہ کمان میں جوڑ کر بچہ کی گردن پر لگایا۔ افسوس وہ بچہ حسین کی آغوش میں تمام ہو گیا۔

امام کے انصار کی وفاداری کا تذکرہ کہاں ہو سکتا ہے سب سے بڑی چیز جو امام کو برابر پیش نظر رہی وہ اہل حرم کی حفاظت تھی۔ یہ اصحاب اہل حرم کی حفاظت کے لیے برابر سینہ سپر رہے۔ بڑا سخت موقع[۱] وہ تھا کہ جب ظہر سے پہلے عمر سعد نے حکم دیا ہے کہ فوج حسینؑ کے خیموں میں آگ لگا دو۔ آگ لگا دی گئی اور اصحاب کے خیمے جل گئے۔ انھوں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ مگر آخر میں شمر نے امام کے خیمۂ خاص پر حملہ کر کے اپنا نیزہ خیمہ کے اوپر مارا اور کہا کہ

---

[۱] محاربۂ کربلا صفحہ

آگ لاؤ میں اس گھر کو رہنے والوں سمیت جلا دوں۔ اس آواز کا سننا تھا کہ خیمہ میں ایک شور نالہ و فریاد کا بلند ہو گیا یہ وقت وہ تھا کہ صحابہ کی زیادہ تعداد شہید ہو چکی تھی مگر پھر بھی زہیر بن قین کو تاب نہ رہی۔ اپنے دس ساتھیوں کے ساتھ حملہ کیا اور اتنا سخت حملہ کہ شمر اور اس کی فوج کو خیموں کے پاس سے ہٹا دیا

مبارکباد دیتا ہوں اصحاب حسینؑ کو تم نے ہر مصیبت میں آقا کا ساتھ دیا۔ امام بھوکے پیاسے رہے تو تم بھی آب و غذا سے محروم رہے۔ امام درجہ شہادت پر فائز ہوئے تو تم بھی خاک و خون میں تڑپ کر شہید ہوئے۔ ایک مصیبت یہ رہی جاتی تھی کہ امام کے خیموں میں بعد عصر آگ لگائی جائے گی تو تم نے اس میں بھی ساتھ دیا اور تمہارے خیمے ظہر کے قبل ہی جلا دیئے گئے۔ مگر پھر بھی بہت بڑا فرق ہے۔ اصحاب کے خیموں میں عورتیں اور بچے نہ تھے۔ مگر خیام حسینی میں جب آگ لگائی گئی تو بی بیاں اور بچے سراسیمہ و مضطرب پھر رہے تھے اور ان کا کوئی پناہ دینے والا نہ تھا۔

یہ تو مردوں کا ذکر تھا۔ کربلا میں عورتوں نے وہ کام کیا ہے جو تاریخ میں یادگار رہے۔

جنادہ[۵] بن کعب شہید ہوئے اُن کی بیوہ نے اپنے بچہ عمرو بن جنادہ سے
کہا جاؤ بیٹا اپنی جان فرزند رسولؐ کی نصرت میں نثار کرو۔ بچہ خدمت امام میں
آیا اور اجازت جہاد طلب کی حضرت نے اجازت دینے سے انکار کیا اور فرمایا
ابھی تو اس کا باپ معرکۂ جنگ میں قتل ہوا ہے اب یہ بھی میدان جنگ میں
جائے تو اس کی ماں کے دل پر کیا گذرے گی

یہ سننا تھا کہ بچہ نے کہا۔ آقا مجھے میری ماں ہی نے تو بھیجا ہے اُنھوں
ہی نے تو مجھے یہ جنگ کا لباس پہنایا ہے۔ اب سُنیے کہ امام نے اجازت جہاد
دی۔ بچہ میدان میں آیا اور لڑ کر قتل ہوا۔ دشمنوں نے اس کا سر کاٹ کر
فوج حسینی کی طرف پھینکدیا۔ ماں نے جو بچہ کا سر دیکھا گود میں اُٹھالیا او
کہا شاباش بیٹا شاباش تو نے میرا دل خوش کر دیا اور میری آنکھیں ٹھنڈی
کر دیں۔ پھر اُس سر کو فوج دشمن کی طرف پھینک دیا اور خود عمود خیمہ لے کر
دشمنوں پر حملہ کر دیا۔ امام نے اسے گوارا نہ کیا اور اُس عورت کو خیمہ کی
طرف واپس کر دیا۔

یہ امام کو صحابہ کے ناموس کی عزت کا خیال تھا۔ آپ کو ایک عورت کا
باہر رہنا گوارا نہ ہوا اور باوجودیکہ اُس کا والی و وارث قتل ہو چکا تھا

[۵] محاربہ کربلا صہ ۳۹

مگر امام نے کوشش کر کے اُسے خیمہ کی جانب بھیجدیا۔ مگر کون تھا عبد جب خود حسینؑ کے اہل حرم خیموں سے باہر نکلے۔ کون تھا جو اُس وقت اُن کو سمجھا کر خیموں میں بھیجتا۔ خیمے تھے ہی کہاں خیموں میں تو آگ کے شعلے بلند تھے۔ اچھا بی بیوں کے سر پہ جو چادریں تھیں کاش وہی چھوڑ دی جاتیں۔ مگر یہ بھی تو نہیں ہوا ظلم کی حد یہ تھی کہ کوفہ و شام کے بھرے بازار اور عترت رسول ننگے سر۔ اور سید سجاد کے گلے میں طوق و زنجیر آپ فرماتے تھے ؎

اُقَادُ ذَلِیلاً فِیْ دِمَشْقَ کَاَنَّنِیْ مِنَ الزَّنْجِ عَبْدٌ غَابَ عَنْہُ نَصِیْرٌ

"مجھے دمشق میں اس طرح ذلت کے ساتھ لے جا رہے ہیں جس طرح غلام حبش و زنگبار کو لے جاتے ہیں اور غلام بھی وہ جس کا کوئی مددگار نہ ہو"

مجلسِ چہارم

محرم کی چوتھی تاریخ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ حُبُّ عَلِیٍّ یَاْکُلُ الذُّنُوْبَ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔

جناب رسالتمآب ارشاد فرماتے ہیں کہ علی بن ابی طالب کی محبت گناہوں کو اس طرح کھاتی ہے جس طرح آگ خشک لکڑی کو کھاتی ہے کیا کہنا کلام رسولؐ کی بلاغت کا۔ وہ زبان معدن جو کلام الٰہی کا مظہر بننے کے قابل ہو اُس کا خود کلام بھی دوسروں سے بدرجہا بلند ہوگا۔ حضرتؐ نے گناہوں سے پاک ہونے کا ایک ذریعہ بتلایا ہے وہ گویا اکسیر ہے جس سے ناقص نفوس کامل بنتے ہیں۔ پست اخلاق بلند ہوتے ہیں اور گناہگار انسان نیکوکار ہو جاتے ہیں۔ وہ علی ابن ابیطالب کی محبت ہے۔ اس محبت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ گناہ نیست و نابود ہو جائیں بالکل اس طرح کہ جیسے آگ کے شعلوں میں خشک لکڑی جل کر خاک ہو جاتی ہے۔

دیکھیے گناہ کے معنی کیا ہیں؟ خدا کی نافرمانی۔ علی ابن ابی طالب نے اپنی ہستی کو رضائے الٰہی کے عوض فروخت کر ڈالا۔ اس لیے خدا کی نافرمانی علیؑ کو ناپسند اور بالکل مرضی کے خلاف۔ ایک شخص کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان محبوب کو دوست رکھے۔ اُس کی ہر بات کو پسند کرے۔ رضائے محبوب کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔ جتنی یہ باتیں کم ہیں جذبۂ محبت کی کمزوری کا پتہ دیتی ہیں۔ اور جس قدر محبت کامل ہوگی اُتنی ہی یہ باتیں زیادہ ہوں گی۔

انسان جب کسی سے محبت رکھے گا تو کوشش کرے گا کہ وہ باتیں کرے جس سے اُس کا محبوب خوش ہو۔ وہ کوئی ایسی بات کرنا نہ چاہے گا جس سے اُس کے محبوب کو صدمہ پہونچے یا اُس کی مرضی کے خلاف ہو۔ یہ دنیا کی معمولی محبتوں کا تذکرہ ہے۔

محبت کی آزمائش فرمائشوں کی تعمیل سے ہوتی ہے۔ اور یہی طریقہ پروردگار عالم کا اپنے دم بھرنے والوں کے ساتھ رہا کہ جتنا محبت کا دعویٰ زیادہ تھا اُتنے سخت حکم کی تعمیل کا بار ڈال دیا گیا۔ حضرت ابراہیمؑ تمام انبیا میں خُلت کا درجہ رکھتے تھے یعنی خداوند عالم کی خاص دوستی کے

مرتبہ پر فائز تھے تو دیکھیے اُن کا امتحان کیسا سخت لیا گیا۔ اپنے ہاتھ سے اپنے بیٹے کو ذبح کرنا کوئی معمولی بات ہے۔ مگر ابراہیمؑ اس حکم کی تعمیل میں پورے اُترے۔ اس سے اُن کے خلیل رب ہونے پر مُہر تصدیق ثبت ہوگئی۔ پھر کیا ممکن ہے کہ علیؑ کی محبت ہو۔ اور علیؑ کی مرضی، اُن کی خواہش اور اُن کی خوشنودی کی خواہش پیدا نہ ہو۔ ممکن نہیں۔ وہ محبت ہی نہیں جس کے ساتھ یہ نتیجہ ظاہر نہ ہو۔ ضرور اگر محبت ہے تو علیؑ کے افعال و اعمال پر نظر جائے گی۔ اُن کے ہدایات و تعلیمات پر توجہ ہوگی معلوم ہوگا کہ علیؑ کی رضامندی خدا کی خوشنودی سے ہے۔ اُن کی زندگی صرف ہوئی احکام خداوندی کی تعلیم میں۔ اور یہی اُن کا عین مدعا ہے پھر کیا علیؑ کا دوست گناہوں کا ارتکاب کر کے خود علیؑ کو ناراض بنانا چاہے گا۔ کیسے ممکن ہے کہ علیؑ اُس سے خوش ہوں جو خدا کے احکام کی کوئی پرواہ نہ کرتا ہو۔ یہ شخص ہرگز علیؑ سے محبت کا دعویٰ سچا نہیں رکھتا سچی محبت کے ساتھ یہ احساس پیدا ہونا ضروری ہے کہ ہم کوئی بات ایسی نہ کریں جو حضرت علیؑ بن ابی طالب کے منشا کے خلاف ہو اور اس کے معنی یہ ہیں کہ گناہ کا ارتکاب نہ کریں اور اگر کچھ گناہ پہلے ہو گئے ہیں۔

تو اُن پر پشیمان ہو کہ ایسا کیوں ہوا۔ اور اچھا اب آیندہ ایسا نہ ہوگا
اسی کا نام ہی توبہ جس سے انسان گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا
ہی کہ جیسے ابھی شکمِ مادر سے متولد ہوا ہے۔

یہ ہی محبت کا نتیجہ کہ گناہ انسان کے نیست و نابود ہو گئے۔ اب
گناہوں کا پتہ نہیں رہا۔ یہ ہماری غلطی ہوگی اگر حدیث کا مطلب سمجھیں
کہ انسان محبت علیؑ کے ساتھ گناہ کرتا رہے۔ تو وہ سزا کا مستحق نہ ہوگا
یہ بالکل غلط ہی۔ کیونکہ اس صورت میں گناہ تو ہوے اور وہ نیست و نابود
نہ ہوے۔ یہ اور بات ہی کہ وہ بعد کو بخش دیئے جائیں پھر یہ تو بالکل
فطرت کے خلاف ہی کہ کسی کی محبت ہو اور اطاعت کا پتہ نہ ہو۔
جب محبت ہوگی تو اطاعت کی فکر ضرور پیدا ہوگی۔ دیکھیے وہ افراد
جو اعلیٰ درجہ کے شیعہ اور محب اہلبیت تھے۔ اُن کو اپنے فرائض اور
احکام الٰہیہ کی اطاعت کا کتنا خیال رہتا تھا۔

سلمان فارسیؓ، ابوذر غفاریؓ، مقدادؓ، عمار بن یاسرؓ کیا کہنا اُن کے
زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت کا۔ پھر امیر المومنینؑ کے اصحاب مالک اشتر
میثم تمار۔ رشید ہجری اور امام حسنؑ کے اصحاب سفیان بن ابی لیلیٰ حجر بن عدی

وغیرہ۔ یہ تمام بزرگوار اپنے اپنے دور میں بڑے عابد طاعت گزار، شب زندہ دار تھے جن کی ذات پر طاعت و عبادت فخر و ناز کرتی تھی۔ مگر اس کی تکمیل کر دی حسینؑ کے اصحاب نے جو کربلا میں تھے۔ وہاں میں ہر دور میں چند ہی فرد میں تاریخ میں نمایاں پاتا ہوں لیکن اگر مجھ سے اصحاب حسینؑ کی فہرست پوچھیے تو میں ایک ساٹھ بہتر بلکہ اس سے زیادہ کے نام پیش کروں گا۔ انھوں نے ایسے سخت موقع پر عبادتِ خدا اور اطاعت امام کا مظاہرہ کیا ہے جس کی نظیر دستیاب نہیں ہو سکتی

امام رضا علیہ السلام نے ایک موقع پر دوستی و محبت کے دعوے کا امتحان اس طرح لیا تھا کہ تنور میں آگ روشن کر دی اور حکم دیا کہ اس آگ میں کود پڑو۔ ابو سہل خراسانی نے عذر کیا اور ہارون مکی ہی تھے جو فوراً تنور کی طرف بڑھے اور آگ میں کود پڑے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ اس آگ کی کوئی حقیقت نہ تھی اُس آتش موت کے سامنے جو کربلا میں روشن تھی۔ وہاں ایک ہی شخص نکلا جو حکم امام کی اطاعت کرے مگر کربلا میں پورا مجمع ہمہ تن آمادہ تھا اور ایک دوسرے پر سبقت کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اس آگ کے شعلوں میں پہلے کود پڑے۔

پھر دوسرا فرق یہ ہے کہ وہاں امام نے حکم دیا تھا کہ اس تنور میں داخل ہو۔

اور یہاں مظلوم کربلا اپنی بیعت گردنوں سے اُٹھا رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ تم میں سے جس کا دل چاہے اس شب تار میں چلا جائے مگر کیا کہنا اُن بہادروں کی وفاداری کا کہ انھوں نے کہا فرزند رسولؐ یہ ایک دفعہ کا مرنا کیا ہے اگر ستر مرتبہ ہمیں موت آئے اور ہم زندہ ہوں تب بھی تمنا یہی ہوگی کہ آپکے قدموں پر جان نثار کردیں

احکام الٰہی کے احساس کا بڑا نازک اور سخت موقع تھا جب عاشور[۱] کے دن دوپہر ڈھل چکی ہے۔ میدان جنگ میں گرمی سے آگ برس رہی تھی اور خون کی الگ بارش تھی۔ اصحاب حسینؑ نصف سے زیادہ شہید ہو چکے تھے۔ اس عالم میں ظہر کا وقت آتا ہے اور ابو ثمامہ امام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ مولا نماز کا وقت آگیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس نماز کو آپ کے ساتھ پڑھ لوں۔ اس کے بعد دنیا سے جاؤں۔

امام نے سر اُٹھایا اور فرمایا ذَکَرْتَ الصَّلٰوۃَ جَعَلَکَ اللّٰہُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ الذَّاکِرِیْنَ نَعَمْ ھٰذَا اَوَّلُ وَقْتِھَا ۔ تم نے نماز کو یاد کیا خدا تمھیں نمازگزاروں میں محسوب کرے ہاں یہ اول وقت نماز ہے۔ اچھا ان لوگوں سے اتنی مہلت مانگو کہ ہم نماز ادا کرلیں۔

اللہ اکبر رسولؐ کا فرزند جس کے گھر سے نماز کی بنیاد قائم ہوئی وہ نماز کی

[۱] مجاہد بہ کربلا صد[illegible]

مہلت مانگے اور مہلت نہ دی جائے۔ اس سوال کا جو تلخ جواب ملا ہے وہ میں نہ بیان کروں گا۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ حبیب بن مظاہر بیتاب ہو گئے اور کہنے لگے "اے فرزند رسولؐ کی نماز قبول نہ ہو اور تیری نماز قبول ہو گی؟"

حبیب بن مظاہر داد شجاعت دیکر شہید ہو گئے۔ راوی کہتا ہے کہ اُن کے قتل ہونے سے امام کے چہرہ پر شکستگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اور بعض اصحاب بھی شہید ہوئے۔ غرض جنگ جاری رہی مگر اس کے باوجود امام نے نماز جماعت ادا کی اُس طرح جس کا شرع میں مخصوص ایسے موقعوں کے لیے حکم ہے یعنی نماز خوف۔ زہیر[1] بن قین اور سعید بن عبد اللہ حنفی کو کچھ بہادروں کے ساتھ یہ حکم ہوا کہ وہ دشمن کا مقابلہ کریں اور باقی اصحاب حضرت کے ساتھ نماز میں شریک ہوئے۔ سعید[2] بن عبد اللہ حنفی کی وفاداری اس وقت بے نظیر تھی وہ خاص امام کے سامنے کھڑے تھے اور جو تیر امام کی طرف آنے لگتا تھا اُس کو خود اپنے اوپر روکتے تھے یہاں تک کہ زمین پر گرے اور روح نے جسم سے رخصت کی یہی تو وفاداری کے وہ اعلیٰ نمونے تھے جن کی بناء پر حضرت حجت نے زیارت میں ان اصحاب پر سلام کرتے ہوئے فرمایا بِاَبِیْ اَنْتُمْ وَاُمِّیْ طِبْتُمْ وَطَابَتِ الْاَرْضُ الَّتِیْ فِیْهَا دُفِنْتُمْ وَفُزْتُمْ وَاللّٰهِ فَوْزًا عَظِیْمًا فَیَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَکُمْ فَاَفُوْزَ مَعَکُمْ

---

[1] مجاہد کربلا صفحہ ۲۶ [2] مجاہد کربلا صفحہ ۲۷

"میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں تم لوگ خود بھی پاک ہوے اور پاک ہوگئی وہ خاک جس میں تم دفن ہوے اور تم نے خدا کی قسم بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔ کاش میں بھی تمہارے ساتھ ہوتا اور اس کامیابی میں تمہارے ساتھ شریک ہوتا

سعید بن عبد اللہ مبارک ہو تمھیں، تم اپنے مقصد میں بیشک کامیاب ہوے تمھاری جان گئی مگر تمھاری زندگی میں کوئی تیر فرزند رسول تک پہنچنے نہیں پایا۔ مگر خبر لو عصر کے قریب اُس وقت جب تم میں سے کوئی نہیں ہے حسینؑ پر تیر و نیزہ و شمشیر ہر طرح کے برابر حملے ہو رہے ہیں۔ کوئی بچانے والا نہیں۔

افسوس وہ جسم جو رسولؐ کی آغوش میں رہا۔ سینہ پر رہا۔ دوش پر چڑھا۔ فاطمہؑ نے جس کو ناز و نعمت سے پالا آج وہ ٹکڑے ٹکڑے کیا جا رہا تھا۔ امام کے زخموں کی تعداد حد و شمار سے باہر ہے۔ بھلا کون بتلا سکتا ہے۔ جس ایک اکیلے کے سامنے ہزاروں دشمنوں کی تلواریں اور نیزے اور تیر ہوں اُس کے زخموں کی تعداد کا پوچھنا کیا۔ جب ہی تو حجت خدا نے زیارت میں اس طرح سلام کیا۔ اَلسَّلَامُ عَلَی الْاَعْضَاءِ الْمُقَطَّعَاتِ۔ یہ سلام ہو اُن اعضاء پر جو ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے"

مجلس پنجم

محرّم کی پانچویں تاریخ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ "دنیا آخرت کی کھیتی ہے" یعنی آخرت کی کامیابی کا انحصار دنیا کی سعی و کوشش پر ہے جس طرح بغیر کچھ بوئے ہوئے حاصل کی امید رکھنا غلط ہے اسی طرح دنیا میں بیکار رہ کر آخرت کے فائدہ کی امید رکھنا خیال خام ہے۔ دنیا کی زندگی اس آخری منزل کا پیش خیمہ ہے اور ہمیں یہ زندگی اس طرح گذارنا چاہیے کہ ہماری کشت امید آخرت میں لہلہاتی ہوئی نظر آئے۔

خالق عالم نے انسان کی خلقت کا مقصد اپنی عبادت اور بندگی کو قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ "نہیں پیدا کیا ہم نے جن اور انس کو مگر اس لیے کہ میری عبادت کریں" عبادت کے معنی ہیں احساس فرائض کے یعنی ہر بات میں انسان کے

پیش نظر رہے کہ اُس کا فرض کیا ہے اور پروردگار عالم کیا چاہتا ہی۔

اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ بس دن رات آدمی نماز روزہ ہی کرتا رہے۔ یہ بھی ضروری چیز ہی مگر اس کے علاوہ بہت سے فرائض ہیں جو ہر شخص پر عائد ہوتے ہیں خصوصاً بنی نوع انسان کے باہمی حقوق دوسروں کے ساتھ معاملت میں انصاف۔ امانت اور دیانت داری سے کام لینا۔ اس سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہی کسی کمزور پر ہاتھ نہ اُٹھے۔ کسی کو اُس کے ہاتھوں تکلیف نہ پہونچے۔ کسی کا ایک پیسہ اُس کے قبضہ میں نہ آئے اور کسی کی ذرا توہین اور آبرو ریزی نہ ہو۔

پیغمبر اِسلام کا دنیا میں سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ وہ اچھے اخلاق کی تعلیم دیں چنانچہ آپ نے زندگی کے وہ اصول بتلائے جن سے دنیا بھی آباد ہو اور آخرت بھی آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ خدا کی عبادت پہاڑوں کے غاروں میں اور سنسان جنگلوں میں ہو سکتی ہی۔ بلکہ حضرت نے آپس میں میل جول بڑھانے پر زور دیا دنیوی تعلقات وسیع کرنے کی تاکید فرمائی۔ معصوم کا ارشاد ہی

لَیْسَ مِنَّا مَنْ تَرَکَ الدُّنْیَا لِاٰخِرَتِہٖ وَلَا مَنْ تَرَکَ الْاٰخِرَۃَ لِلدُّنْیَا۔

ہم سے کوئی تعلق نہیں اُس کو جو دنیا کو آخرت کے لیے ترک کر دے اور نہ

اُس کو جو آخرت کو دنیا کی خاطر چھوڑ بیٹھے؟

دنیاوی زندگی کی بہبودی کے لیے صنعت و حرفت، تجارت و زراعت سب ہی راستے دکھلائے اور اُن پر چلنے کی تاکید کی۔ یہ آج ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اُن تمام ذرائع کو چھوڑ بیٹھے ہیں اور بیکاری کی زندگی گزارتے ہیں۔ جس کا نتیجہ تباہی اور ہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔

حالانکہ ائمہ معصومین نے تجارت پر ترغیب دینے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اور خود اُس پر عمل کر کے ہمارے لیے مثالیں قائم فرما دی ہیں۔

امامیہ مشن سے "تجارت اور اسلام" کے نام سے جو رسالہ شائع ہوا ہے اُسے دیکھیے اور ملاحظہ فرمائیے کہ ائمہ معصومینؑ نے کس کس طرح قول و عمل دونوں سے اس کی اہمیت کو ظاہر فرمایا ہے۔ میثم تمار کی دکان پر امیرالمومنینؑ کا خرمے فروخت کرنا۔ آپ کا باغوں میں پانی دینا۔ امام جعفر صادقؑ کا اپنے ہاتھ سے دیوار اُٹھانا اور اس کے علاوہ مثالیں۔ ان کے دیکھنے کے بعد ہماری کیا مجال ہے کہ ہم تجارت یا محنت مزدوری کو نگاہِ ذلت و حقارت سے دیکھ سکیں۔

یہ تجارت یعنی خرید و فروخت تو اتنی مستحسن چیز ہے کہ خداوندعالم نے

مخصوص اعزاز کے مقامات پر انہی الفاظ کو صرف فرمایا ہے ملاحظہ کیجئے کہ میدان جنگ اور مجاہدین راہ خدا کا کھنچی ہوئی تلواروں اور نیزوں کے سامنے سر بکف جانا اور منزل شہادت کی طرف قدم اٹھانا کتنی بلند منزل ہے مگر اس کے لیے قدرت کی طرف سے جو لفظ صرف ہوتی ہے وہ خرید و فروخت کی۔ یہ اور بات ہے کہ اس بازار کا خریدار وہ خود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔

"خدا نے خریدا ہے مومنین سے اُن کی جان اور مال کو اس معاوضہ میں کہ اُن کے لیے جنت ہے"

کتنا گراں بہا سودا ہے جو تلواروں کی چھاؤں میں ہو رہا ہے مبارک ہیں وہ لوگ جنھوں نے یہ معاملت خدا کے ساتھ کر لی۔ کہاں یہ نفوس اور اموالِ انسانی جو خود ہی بے بقا اور بے ثبات ہیں۔ اگر آج میدان جنگ میں کام نہ بھی آئیں تب بھی ایک نہ ایک دن رخصت ضرور ہوں گے۔ اور کہاں وہ سرائے باقی اور عالم جاودانی۔ ہمیشہ بہار باغ۔ جہاں خزاں کا گذر نہیں اور پژمردگی کا نشان نہیں۔ مجاہدین راہ خدا اس جان و مال کو راہ خدا میں پیش کر کے اُس نعمت لازوال کے مالک ہو جاتے ہیں۔

جنت اُس وقت اُن کی ملک ہو جاتی ہے۔

یہ اُن تمام مجاہدین کا تذکرہ ہے جن کی نگاہ میں جنت کوئی چیز ہے لیکن وہ بلند نظر ہستی جس کے نزدیک جنت کوئی چیز ہی نہیں وہ جب اپنے نفس کو پیش کرے تو جنت اس قابل نہ ہو گی کہ وہ اُس کے نفس کے مقابل میں لائی جائے، اُس وقت میں جنت سے بالاتر کوئی چیز ہونا چاہیے۔ اور وہ رضائے خداوندی ہے ارشاد ہوا وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ کچھ لوگ وہ ہیں جو اپنے نفس کو خدا کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے بیچ ڈالتے ہیں۔ یہاں ایک طرف ہے بندہ کا نفس اور دوسری طرف ہے خالق کی رضامندی۔ تولے جاتے ہیں اور دونوں پلّے برابر رہتے ہیں اور خالق اس نفس کو اتنا بلند سمجھتا ہے کہ اپنی رضامندی کو اُس کی قیمت قرار دیتا ہے۔

یہ تھا علی بن ابیطالبؑ کا نفس جنھوں نے شب ہجرت دشمنوں کی کھنچی ہوئی تلواروں کے حصار میں بستر رسولؐ پر آرام کر کے یہ استحقاق پیدا کیا کہ رضائے الٰہی کا انھیں مختار و مالک بنا دیا جائے۔ اب کیا ممکن ہے کہ خالق کی رضامندی بغیر علی بن ابی طالبؑ کی خوشنودی کے

حاصل ہو جائے۔

مگر یاد رکھیے کہ خود علیؑ کی خوشنودی بغیر رضائے الٰہی کے غیر ممکن ہے کیونکہ یہ تو بے نفس ہو کر اپنے نفس کو خدا کے ہاتھ فروخت کر چکے۔ اب اس نفس میں اپنے ذاتی جذبات کا پتہ ہی نہیں ہے۔ محبت ہے تو خدا کی راہ میں۔ عداوت ہے تو خدا کے بارے میں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اگر عمرو بن عبدود ایسا دشمن آپ کے ساتھ بے ادبی کرتا ہے تو اس لیے ہاتھ روک لیتے ہیں کہ ذاتی جذبہ شریک ہو جائے۔ چاہتے ہیں کہ ہاتھ کی ہر جنبش صرف خدا کی مرضی کے لیے ہو۔ جب اتنا خالص عمل ہو تو چاہے دیکھنے میں وہ ایک ہی ضربت ہو مگر وزن اس کا اتنا ہوگا کہ جن و انس سب کی عبادت سے بڑھ جائے۔ یہ بھی تو جناب رسالتمآب نے فرمایا ضَرْبَۃُ عَلِیٍّ یَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَۃِ الثَّقَلَیْنِ۔

کوئی شک نہیں کہ شب ہجرت امیر المومنینؑ نے اپنے نفس کو راہ خدا میں بیچ ڈالا تھا اور اس میں شبہ ہی کیا ہو سکتا ہے جبکہ خداوند عالم نے وحی کے ذریعہ سے اس کی تصدیق کر دی اور قرآن کی آیت گواہی دیتی ہوئی اتری۔ مگر کہنے دیجیے مجھے کہ عالم مشاہدہ میں علیؑ کے پورے

مقصد کی گویا تکمیل نہیں ہوئی یعنی علیؑ کا نفس پھر بھی باقی رہا اور جس طرح اسمٰعیلؑ ذبح کے لیے آمادہ ہو کر لیٹے مگر فدیہ آگیا اس لیے لقب تو اُن کا ہو گیا ذبیح اللہ مگر پھر بھی وہ مذبوح نہ ہوئے۔ اُسی طرح علیؑ نے اپنے نفس کو خدا کی راہ میں دے دینے کا پورا تہیا کر لیا تھا۔ اس لیے ہو تو گیا اُن کا نفس خدا کا مگر پھر بھی وہ محفوظ رہا لیکن کربلا میں حسینؑ نے اپنے نفس کو جو راہِ خدا میں دینے کا تہیا کیا تھا اُس کی پوری تکمیل ہوئی اُنھوں نے جو بیعانہ اپنی جان کا خدا کے ہاتھ کیا اُس پر اپنے خون کی مہر لگا کر ہمیشہ کے واسطے ثابت کر دیا۔

حسینؑ نے تنہا اپنا نفس خدا کے ہاتھ نہیں فروخت کیا تھا۔ بلکہ وہ بازار شہادت میں بڑے ساز و سامان سے آئے تھے۔ اُن کا پورا کنبہ اُن کے ساتھ تھا اور ایک سے بڑھ کر ایک سے ایک نفیس جنس وہ پیش کرتے ہیں۔ پہلے اصحاب انصار کے نفوس کا تحفہ پیش کیا۔ پھر عزیزوں کی باری آئی کڑیل جوان علی اکبر جو ہمشکل پیغمبرؐ بھی تھا اس کے پیش کرتے وقت حسینؑ نے خدا کو گواہ بھی کیا۔ پھر حسنؑ مجتبیٰ کے یتیم فرزند، اپنے عزیز ترین بھتیجے قاسم کو، پھر اپنے بھائیوں کو اور خصوصیت سے قمر بنی ہاشم

ابوالفضل العباسؑ کو یکے بعد دیگرے راہ خدا میں دیتے رہے۔ جب کوئی جوان باقی نہ رہا تو امام نے رباب کی آغوش میں ایک گوہر بے بہا کو تلاش کیا۔ وہ شیر خوار بچہ جو خود میدان جنگ میں آنے کے قابل نہ تھا۔ حسینؑ نے اپنے ہاتھوں پر لیا اور حرملہ کے تیر نے اس کا کام تمام کیا۔ یہ آخری نذرانہ تھا جو حسین بارگاہ الٰہی میں پیش کر سکتے تھے۔ اب کون تھا؟ بس خود امام حسینؑ آخر آپ نے اپنے نفس عزیز کا ہدیہ بھی پیش کر دیا۔

مجاہدین راہ خدا کے تذکرہ میں آیت نے دو چیزوں کا تذکرہ کیا تھا نفوس اور اموال۔ امام حسینؑ نے نفوس کو اس طرح دیا۔ اور اموال وہ بعد عصر دشمنوں نے اس طرح لوٹے کہ بی بیوں کے سروں سے چادریں اور زیور تک اُتار لیے۔

مگر ایک خاص قسم کی قربانی کا امام حسینؑ کے یہاں اضافہ ہو گیا اور وہ عزت ناموس کی قربانی ہے امام اپنے ساتھ اہل حرم کو اسی لیے لائے تھے۔ کون عزت دار اہل حرم؟ آپ جانتے ہیں وہ خاندان رسالت کی بی بیاں جو دونوں جہاں کی شہزادیاں تھیں۔ سنا آپ نے وہ بی بیاں کہ جن کی ماں کا جنازہ شب کو اُٹھا تھا۔ کیا بتاؤں کہ بعد شہادت حسینؑ کیا ہوا؟

کوفہ و شام کے بازار، ابن زیاد اور یزید کے بھرے ہوئے دربار اور علی و فاطمہ کی اولاد رسن بستہ۔

عجیب بے بسی اور بے کسی کا وقت تھا دربار یزید میں اُس وقت جب ایک شامی سُرخ رنگ کھڑا ہوا ہے اور اُس نے یزید سے کہا ہے: اے یزید میں اس مالِ غنیمت سے کچھ نہیں مانگتا مگر یہ لڑکی جو سامنے کھڑی ہے مجھ کو دے دے۔ اور اشارہ کیا فاطمہ کبریٰ کی طرف۔

یہ سنا تھا کہ فاطمہ کبریٰ دوڑ کر جناب زینب سے لپٹ گئیں اور کہا کیوں پھوپھی! کیا یہ بھی ہونے والا ہے کہ اولاد رسول کنیزی میں دی جائے جناب زینب نے فرمایا اے فاطمہ کیا مجال یزید کی جو تمھیں کنیزی میں دے یزید کو غصہ آگیا۔ کہا اے زینب اگر میں اسے دیدوں تو کیا کرو گی۔

یزید کی سخت کلامی پر آخر زینب کو کہنا پڑا کہ اے یزید تو نے ہمارے وارثوں کو تو قتل ہی کر دیا۔ اب ہم تیرے بس میں ہیں جو چاہے ظلم و ستم کرلے۔

Scanned by CamScanner

مجلس ششم

محرم کی چھٹی تاریخ

قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ

خداوند عالم نے اپنے حبیب خاص سردار انبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا ہے کہ اے رسولؐ یقیناً تم بہت بڑے اخلاق کے درجہ پر فائز ہو۔

یہ رسالتمآبؐ کے اخلاقی کمال کی وہ سند ہے جس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ کوئی چھوٹا شخص اگر کسی چیز کو "عظیم" کہہ دے تو وہ اُس کی حقیقی عظمت کی دلیل نہیں ہے کیونکہ یہ شخص کوتاہ نظر، محدود اطلاع رکھنے والا اور کم حوصلہ ہے۔ یہ ہر ذرا سی چیز کو بہت بڑا سمجھ سکتا ہے مگر خدائے بزرگ و برتر جسے آپ ہر نماز میں کتنی ہی دفعہ اور ہر اذان میں چھ مرتبہ اللہ اکبر کہتے ہیں یعنی وہ سب سے بڑا ہے۔ بلکہ قرآن مجید میں ارشاد کیا ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ یعنی خدا کی ذرا سی رضا ہر بڑی چیز سے بڑی۔

پھر وہ اگر کسی شے کو عظیم کہہ دے تو اُس کی عظمت کا کیا کہنا۔ یقیناً دنیا کی عظمتیں نثار ہوں گی اُس عظمت کے درجہ پر جو اس طرح ثابت ہو۔ رسولؐ اکرم کی اخلاقی بلندی کا اعتراف تو ہر دوست و دشمن کو تھا۔ بچپنے سے آپ کی سچائی اور امانت کا یہ حال تھا کہ مشرکین قریش نے آپ کا نام رکھ لیا تھا "صادق" اور "امین" اور حقیقتاً ان دونوں صفتوں کو آپ میں نمایاں ہونے کی ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ اس سے آپ کے دعوائے رسالت کا قطعی ثبوت ہوتا ہے۔ بھلا جو شخص سچا ہو وہ جھوٹا دعویٰ رسالت کا کیسے کریگا۔ اور جو امین ہو وہ پیغام خدا کے پہونچانے میں خیانت کس طرح کرسکتا ہے۔ کفار کی زبان سے آپ کے صادق اور امین ہونے کا اقرار قطعی دلیل ہے اس بات کی کہ جو آپ دعویٰ کریں وہ سچا اور جو کچھ آپ پیغام پہونچائیں وہ صحیح ہے۔ پھر بعثت کے بعد آپ کے اخلاق بہت بڑی مقناطیسی کشش رکھتے تھے جو دوسروں کو اسلام سے قریب لاتے تھے ایک طرف مروت، تواضع، حلم، تحمّل، عفو، کرم، سخاوت یہ صفتیں آپ پر ختم تھیں۔ دوسری طرف استقلال، ثبات قدم، جفاکشی اور قوت قلب میں آپ کا نظیر نہ تھا۔

اپنوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ حسنِ معاشرت کی ایک اعلیٰ مثال تھا تاریخ و سیر کی گواہی ہے کہ جس سے ملاقات ہوتی تھی حضرت خود سلام میں ابتدا فرماتے تھے۔ کشادہ پیشانی اور بشاشت سے گفتگو کرتے۔ راستا چلنے میں پس پشت سے اگر کوئی آواز دیتا تو آپ صرف چہرہ موڑ کر اُس کی طرف نہ دیکھتے بلکہ پورے قد سے اُس کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔

آج ہم میں کوئی ذرا بڑا آدمی ہو جاتا ہے تو مُنھ دے کر بات نہیں کرتا۔ ابتدا بہ سلام کا کیا ذکر جواب سلام میں بھی تکلف ہوتا ہے۔ مگر رسولؐ کی اپنی اُس عظمت کے ساتھ یہ حالت تھی۔

صحرا نشین عرب آپ کے پاس آتے اور طرح طرح کی بدتمیزیاں بھی کرتے تھے مگر وہ خلق مجسم تیوریوں پر بل نہ لاتا تھا۔

اغیار بلکہ دشمنوں کے ساتھ آپ کے درگذر اور عفو کا کیا ذکر ہو سکتا ہے مکہ معظمہ میں ایک عورت تھی کہ جب آپ اُس کے مکان کی طرف سے گذر ہوتا تھا تو وہ کوٹھے پر سے کوڑا کرکٹ آپ کے سر مبارک پر ڈال دیتی تھی اس کو عرصہ گذر گیا۔ اتفاق سے وہ بیمار ہو گئی حضرت کا جو اُس طرف پھر گذر ہوا تو اُسے نہ پایا۔ دریافت فرمایا معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے۔ حضرت

اُس کی عیادت کو تشریف لے گئے جب اُس کی نظر دور سے آپ پر پڑی
سمجھی کہ حضرت انتقام لینے آئے ہیں کہنے لگی" اب تم مجھ سے بدلا لینے
آئے ہو جب میں بستر بیماری پر پڑی ہوئی ہوں "
حضرت نے فرمایا کنیز خدا میں تجھ سے بدلا لینے نہیں آیا ہوں بلکہ
میں نے سُنا کہ تو بیمار رہی ہے تو میں تیری عیادت کے لیے آیا ہوں۔ یہ سُننا تھا
کہ اُس کا دل نور ایمان سے منور ہوا اور اُس نے کہا اَشْھَدُ اَنْ لَا
اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ " میں گواہی دیتی ہوں
کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے اور آپ اُس کے سچے رسول ہیں "
حضرت کی مساوات پسندی کا یہ عالم تھا کہ مرض الموت میں منبر پر تشریف
لے گئے اور فرمایا اگر میرے ہاتھ سے کسی کو ایذا پہونچی ہو تو وہ ابھی مجھ سے
بدلا لے لے۔ ایک شخص مجمع میں سے کھڑا ہو گیا اور عرض کیا یا رسول اللہؐ
ایک روز آپ ناقہ پر سوار تشریف لیے جا رہے تھے آپ کے ہاتھ میں تازیانہ
تھا میں ناقہ کے قریب سے ہو کر گذرا اس حالت میں کہ آپ ناقہ کو تازیانہ
لگا رہے تھے وہ تازیانہ مجھ پر پڑ گیا اور مجھ کو اُس سے تکلیف ہوئی میں
اُس کا قصاص چاہتا ہوں۔ حضرت نے بلال سے فرمایا کہ ہمارا تازیانہ

معشوق لے آؤ بلال گئے اور صحاب میں بے چینی پیدا ہو گئی کہ اس حالت بیماری میں رسولؐ سے یہ شخص کیسے قصاص لے گا مگر وہ لوگوں کے سمجھانے پر بھی نہیں مانا۔

تازیانہ آیا رسولؐ نے اُس کے ہاتھ میں دیا۔ فرمایا اے بھائی اپنا قصاص لے لے۔ اُس نے کہا جب آپ نے میرے جسم پر تازیانہ لگایا تو اُس وقت میرے جسم پہ پیراہن نہ تھا۔ آپ نے برہنہ جسم پر تازیانہ لگایا۔ حضرت نے یہ سُن کر پشت مبارک سے لباس کو ہٹا دیا تاکہ قصاص میں کوئی کمی نہ رہ جائے جسم مبارک کا کھلنا تھا کہ اُس نے بڑھ کر مہر نبوت کے بوسے لینا شروع کر دیئے، کہتا تھا کہ بھلا میری بھی مجال ہے کہ میں اس جسم سے تازیانہ کو مس کروں۔

افسوس کون سمجھائے کربلا والوں کو کہ حسینؑ کا وہ جسم جس پر تلواریں اور نیزے پڑ رہے ہیں حسینؑ کا جسم نہیں ہے بلکہ وہ رسولؐ کا جسم ہے مگر امت کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔

یہ تھے رسول اللہ کے اخلاق جو آپ کو تمام دنیا سے بالاتر قرار دیئے ہوئے تھے۔

اخلاق میں ایک مقناطیسی کشش ہوتی ہے جو اغیار تک کے دلوں کو جذب کر لیتی ہے اور ایک جذبۂ محبت پیدا کر دیتی ہے۔ پھر اُن لوگوں کا کیا ذکر جو اُس شخص کے ساتھ کوئی قریبی تعلق بھی رکھتے ہوں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ رسولؐ دنیا کے محبوب اور ہر دلعزیز تھے اور خود آپ کے اہلبیت کو آپ سے وہ محبت تھی جو کسی بزرگ خاندان کے گھرانے والوں کو اُس کے ساتھ نہیں ہوتی۔ محبت کا احساس اُس وقت بہت بڑھ جاتا ہے جب محبوب آنکھوں سے اوجھل ہو جائے اُس وقت اُس کی ہر معمولی سے معمولی یادگار کو سر آنکھوں پر رکھا جاتا ہے اور سینہ سے لگایا جاتا ہے آپ کو معلوم ہے کہ ایک شخص کی بہترین یادگار اُس کی تصویر ہے۔ قدرت نے اہلبیت کے گھر میں رسولؐ کے بعد آپ کی ایک مکمل تصویر پیدا کر دی تھی جو نہ صرف صورت میں بلکہ سیرت میں بھی رسولؐ کی تصویر تھی۔ وہ حسین ابن علیؑ کے نور نظر، ام لیلیٰ کی امیدوں کی دنیا علی اکبر تھے۔ جب[1] ہی تو جس وقت علی اکبر امام سے رخصت ہونے لگے تو حضرت نے اپنے ہاتھ اٹھائے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا۔ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ عَلٰی ھٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ فَقَدْ بَرَزَ اِلَیْھِمْ غُلَامٌ اَشْبَہُ النَّاسِ خَلْقًا وَّخُلُقًا وَّمَنْطِقًا بِرَسُوْلِکَ وَکُنَّا اِذَا

[1] شہدائے کربلا حصۂ سوم

اشْتَقْنَا اِلٰی نَبِیِّکَ نَظَرْنَا اِلٰی وَجْهِهٖ۔ خداوندا گواہ رہنا اس قوم کے ظلم پر کہ اب جاتا ہے ان کی طرف وہ نوجوان جو صورت و سیرت و گفتار میں تیرے رسولؐ سے مشابہ ہے خداوندا جب ہم مشتاق ہوتے تھے تیرے رسول کی زیارت کے تو اس کے چہرہ کو دیکھ لیتے تھے؛

پھر دل کی بےچینی اور بڑھی۔ حضرت نے عمر سعد کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا یَا ابْنَ سَعْدٍ قَطَعَ اللّٰهُ رَحِمَكَ كَمَا قَطَعْتَ رَحِمِيْ وَلَمْ تَحْفَظْنِيْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔ اے عمر سعد! خدا کرے تیری مراعات کبھی کوئی نہ کی جائے جس طرح تو نے میری قرابتداری کی مراعات نہ کی اور رسول اللہ کی خاطر میرے حقوق کا تو نے ذرا بھی خیال نہ کیا؛

علی اکبر میدان جنگ میں آئے اور رجز پڑھ کر بہادرانہ حملہ کیا کیا کہنا اس شجاعت اور بہادری کا جو شبیہ پیغمبرؐ نے دنیا کے سامنے پیش کی ہے روایت میں ہے کہ آپ نے اتنی جنگ کی کہ مقتولین کی کثرت سے دشمن کی فوج چیخ اٹھی۔ جوانی اور اس پر اتنی شدید جنگ۔ اس کے ساتھ کچھ زخم بھی آ گئے۔ اب علی اکبر کو پیاس کی انتہا نہ رہی۔ کہا جاتا ہے کہ امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

یَا اَبَتِ الْعَطَشُ قَدْ قَتَلَنِیْ وَثِقْلُ الْحَدِیْدِ اَجْهَدَنِیْ فَهَلْ اِلٰی شَیْءٍ مِنَ الْمَاءِ سَبِیْلٌ ۔ بابا پیاس نے اب مجھے مار ڈالا ہے اور گرانی آہن نے میری جان پر بنا دی ہے، کیا کہیں سے تھوڑا پانی بھی ممکن ہے؟ ممکن ہے یہ بھی ایک طریقہ دنیا کو امام کی بیکسی اور مظلومیت کے دکھلانے کا ہو۔ خبر لیجیے حسینؑ کے دل کی، وہ علی اکبر کو کیا جواب دیں آپنے انتہائی مایوسی کے ساتھ فرمایا، پانی کہاں ہے، جاؤ تمھارے دادا رسول اللہ آب کوثر سے تمھیں سیراب کرینگے۔

علی اکبر دوبارہ میدان جنگ میں آئے اور پھر سخت جہاد کیا۔ افسوس مُرّہ بن مُنقذ عبدی ملعون نے غضب کیا۔ دھوکا دے کر ایک نیزہ پشت پر لگایا جس سے علی اکبر زمین پر آگئے دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور شہزادے کے جسم کے تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے امام پر اس شہادت کا بڑا اثر ہوا آپ فرماتے تھے عَلَی الدُّنْیَا بَعْدَكَ الْعَفَاءُ۔ اے بیٹا تیرے بعد دنیا کی زندگی پر خاک ہے۔

خیمہ کے اندر اس عظیم واقعہ سے ایک تہلکہ پڑ گیا اور اُس کہرام میں کمسن بچے گھبرا کر خیمہ سے باہر آگئے۔

لو عزاداران حسینؑ! بے رحم دشمنوں کو موقع مل گیا۔ ایک شقی نے ایک تیر عبداللہ بن مسلم کو لگایا۔ جو بچہ کی پیشانی پر آیا بچہ نے گھبرا کر اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھا۔ تیر نے ہاتھ کو پیشانی کے ساتھ چھید دیا۔ پھر دوسرا تیر آیا جو سینہ پر پڑا اور بچہ کا کام تمام ہو گیا۔

مجلس ہفتم

محرم کی ساتویں تاریخ

قَالَ اَبُوْعَبْدِ اللهِ الْحُسَیْنُ خُطَّ الْمَوْتُ عَلٰی ابْنِ اٰدَمَ مَخَطَّ الْقِلَادَةِ عَلٰی جِیْدِ الْفَتَاةِ

حضرت سید الشہدا امام حسین علیہ السلام نے اپنے اُس خطبہ میں جو مدینہ سے روانگی کے وقت ارشاد کیا تھا فرمایا ہے کہ "موت انسان کے گلوگیر ہے اس طرح جیسے گردن بند جوان عورت کی گردن میں ہوتا ہے" مقصود تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہی کہ انسان کے گلے میں موت کا پھندا ہی اور وہ ایک دن دنیا سے رخصت ضرور ہوگا۔ مگر دیکھیے کہ آپ نے اس کا تذکرہ کتنے دلکش انداز میں کیا ہی۔ جس سے معلوم ہوتا ہی کہ موت کوئی ناگوار طبع چیز نہیں ہی بلکہ حسین اور دیدہ زیب ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ انسان کے دہن سے الفاظ ویسے ہی نکلتے ہیں جیسے خیالات اُس کے دماغ میں راسخ ہوتے ہیں۔ امام حسینؑ

اُس گھرانے کی ایک بزرگ فرد تھے جہاں موت سے کبھی خوف نہیں کیا گیا بلکہ بہادری سے مرنا زندگی سے زیادہ پسند رہا۔

وہ امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ تھے جن کا قول تھا کہ مَا اُبَالِیْ دَخَلْتُ اِلَی الْمَوْتِ اَوْخَرَجَ الْمَوْتُ اِلَیَّ " مجھے پرواہ نہیں کہ میں موت کی طرف جا رہا ہوں یا موت میری جانب آتی ہے " ایک جگہ فرماتے ہیں اِنَّ ابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ اٰنَسُ بِالْمَوْتِ مِنَ الطِّفْلِ بِثَدْیِ اُمِّہٖ " میں موت کے ساتھ اُس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا کہ بچہ کو آغوش مادر سے اُنس ہوتا ہے "

بے شک وہ اُس طرح کی موت کو ناپسند کرتے تھے جو بزدلی کے ساتھ بستر راحت پر ہو۔ ایک مرتبہ اصحاب سے خطاب کر کے فرماتے ہیں اِنَّ اَکْرَمَ الْمَوْتِ الْقَتْلُ وَالَّذِیْ نَفْسُ ابْنِ اَبِیْطَالِبٍ بِیَدِہٖ لَاَلْفُ ضَرْبَۃٍ بِالسَّیْفِ اَھْوَنُ عَلَیَّ مِنْ مِیْتَۃٍ عَلَی الْفِرَاشِ " معزز ترین موت یہ ہے کہ انسان قتل ہو۔ قسم اُس خدا کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ ہزار ضربتیں تلواروں کی آسان ہیں فرش خواب پر ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے "

آپ کا طرزِ عمل بھی اس کا مظہر تھا۔ ابتدائے شباب میں جب ہر انسان کو اپنی عمر انتہائی عزیز ہوتی ہے رسول کا ارشاد کہ علیؑ میرے بستر پر سو رہو اور علیؑ کا بسر و چشم آمادہ ہو جانا، یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ معلوم تھا کہ خون کے پیاسے دشمن کھینچی ہوئی تلواریں لئے قتل پر آمادہ ہیں مگر وہاں راہ حق میں موت کوئی چیز ہی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ سوئے اور بڑے اطمینان کی نیند سوئے یہاں تک کہ اپنے نفس کو خدا کے ہاتھ فروخت ہو جانے کی قرآنی دستاویز حاصل کر لی۔

جنگ اُحد میں اُس وقت جب جنگ بگڑی ہے اور تمام مسلمانوں نے راہ فرار اختیار کی ہے۔ کس لئے؟ اپنی جان بچانے کے لیے نہ؟ اور رسولؐ زخمی ہو کر ایک نشیب میں گر گئے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ قَدْ قُتِلَ مُحَمَّدٌ کی آواز بھی بلند ہو گئی تھی اُس وقت علیؑ ہی تھے کہ ہزاروں دشمنوں میں شمشیر زنی کر رہے تھے۔

وہ موت کو جو مظلومیت کے ساتھ حق کی راہ میں ہو مصیبت نہیں ایک نعمت سمجھتے تھے جب ہی اُس موقع پر کہ جب رسالت مآبؐ نے خبر شہادت سنائی ہے اور فرمایا ہے کہ اے علی تم اس پر صبر کرو گے؟

تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرے مذاق میں یہ صبر کا محل نہیں ہے بلکہ میں اس پر شکر ادا کروں گا۔

موازنہ کیجئے اس کا حضرت اسمٰعیل کے جواب سے جب حضرت ابراہیمؑ نے اُن سے اپنا خواب بیان کیا اِنِّیٓ اَریٰ فِی الْمَنَامِ اَنِّیٓ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی "میں نے خواب دیکھا ہے کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں" تو اسمٰعیلؑ نے کہا تھا کہ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ "اے بابا جو آپ کو حکم ہوا ہے بجا لائیے آپ مجھے انشاء اللہ صابرین میں سے پائیے گا"۔

بلند منزل ہے اور یقیناً اسمٰعیلؑ کا مرتبہ بہت جلیل ہے۔ اپنی گردن کو کٹانے پر خوشی سے رضامند ہونا ہر شخص کا کام نہیں۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اسمٰعیلؑ نے اس کو مصیبت سمجھا جب ہی وہ اس موقع پر صبر کی لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ مجھے صابرین کی منزل میں پائیے گا مگر علی بن ابی طالبؑ کا قول ہے کہ یہ صبر کا موقع نہیں بلکہ شکر کی جگہ ہے۔ اُن کے نزدیک موت مصیبت نہیں بلکہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جبکہ وہ حکم خدا سے ہو۔ شرع میں موت کی

آرزو بے شک مذموم ہے مگر وہ اس حیثیت سے کہ خدا کی دی ہوئی زندگی سے ناراضگی اور تقدیر خداوندی سے بیزاری ہو مگر خداوند عالم کی جانب سے راہ خدا میں اپنی موت مقرر ہونے کا اشتیاق خاصان خدا کا مخصوص امتیاز ہے۔

یہ تو امیر المومنینؑ تھے آپ کی شجاعت آپ کی معرفت خدا، آپ کے صبر و استقلال کا تذکرہ کیا ممکن ہے اس خاندان کے بچوں تک میں یہی جذبہ کارفرما تھا۔

سنیئے آج کی تاریخ آپ اسی طرح کا ذکر سننے کے بھی مشتاق ہیں، وہ یتیم امام حسنؑ قاسم ہیں۔ ان کا سن کیا تھا؟ آپ کو معلوم ہے کہ ابھی حد بلوغ تک نہ پہونچے تھے۔ بارہ تیرہ برس کی عمر۔ اس چھوٹے سے سن میں موت کا اشتیاق تھا۔

تاریخ کی روایت ہے کہ شب عاشور جب امام نے خطبہ ارشاد فرمایا اور سب کو شہادت کی اطلاع دی تو قاسم خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا چچا جان! میرا بھی نام دفتر شہدا میں ہے ـ میں بھی کل قتل ہونگا؟ امام کو شاید قاسم کا امتحان منظور ہوا۔ فرمایا کیفَ الموتُ عندکَ

"اے قاسم تمھارے مذاق میں موت کیسی ہے" کہا "احلیٰ مِنَ العَسَل اے چچا شہد سے زیادہ شیریں"۔ اب حضرت نے فرمایا کہ ہاں تم بھی شہید ہو گے اور تمھارا چھوٹا بھائی علی اصغر بھی۔ قاسم اپنے قتل کی خبر سُن کر تو مطمئن ہوسے ہو نگے مگر علی اصغر کا ذکر سُنتے ہی بے چین ہو گئے غیرت ہاشمی کو جوش آ گیا کہنے لگے چچا یہ علی اصغر کیسے شہید ہو گا کیا اشقیا خیمہ میں عورتوں کے چلے جائیں گے، امام نے شہادت علی اصغر کا حال تفصیل سے بیان کر کے قاسم کی اس بے چینی کو دور کر دیا۔

میں عرض کرتا ہوں اے مولا مے لیجئے تسکین قاسم کو یہ فرما کر کہ علی اصغر کے قتل کے وقت دشمن خیموں میں داخل نہیں ہوں گے مگر اس کے تھوڑی دیر بعد آپ کی شہادت کے بعد وہی خیمے ہوں گے اور دشمن درانہ ان خیموں میں داخل ہوں گے مال و اسباب غارت کر رہے ہوں گے اور انتہا یہ کہ سدانیوں کے سروں پر چادریں بھی نہ رہیں گی۔ قاسم اس مصیبت کا ادنیٰ سا خیال کر کے تڑپ گئے مگر وہ زین العابدین کا دل تھا کہ اس سخت مصیبت پر صبر کیا اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بہنوں پھوپھیوں کو قید کر کے شہر بہ شہر اور دیار بہ دیار

پھرایا جارہا ہے۔

یہ تھا قاسم کا ولولہ اور جوش جو عاشور کے دن سے پہلے اُن کے سینہ میں تلاطم برپا کئے تھا پھر عاشور کے دن کیا ممکن تھا کہ وہ جہاد کے لیے بے چین نہ ہوتے۔ مگر امام نے کسی شہید کو اجازت دینے میں اس کے پہلے اتنا توقف نہیں فرمایا تھا کہ جتنا قاسم کے اجازت دینے میں آپ نے فرمایا۔

وہ سخت وقت ہمارے سامنے ہے کہ جب علی اکبر میدان جہاد میں جارہے تھے تو امام نے علی اکبر کو میدان میں جانے سے روکا نہیں مگر قاسم کو حضرت کسی طرح اجازت دیتے ہی نہ تھے۔

ممکن ہے یہ سمجھتے ہوں کہ یہ حسن مجتبیٰؑ کی نشانی اور اُن کی امانت ہیں اور ممکن ہے امام حسنؑ کی وصیت جس کے بظاہر اسباب اس وقت پورا ہونے کا موقع نہ تھا آپ کو اجازت دینے سے مانع ہو رہی ہو۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ امامؑ نے قاسم کو انتہائی اصرار کے باوجود کسی طرح اجازت نہ دی اس حد تک کہ قاسم کو مایوسی ہو گئی اور وہ محزون و مغموم ہو کر خیمہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ ایک مرتبہ

خیال آیا کہ میرے بازو پر ایک تعویذ بندھا ہوا ہے۔ یہ امام حسنؑ نے اپنی وفات کے موقع باندھ دیا تھا۔ قاسم نے اس تعویذ کو کھول کر پڑھا اس میں لکھا تھا کہ جب میرے بھائی حسینؑ نرغۂ اعدا میں گھر جائیں تو تم اپنی جان اپنے چچا پر نثار کرنا۔

قاسم یہ تعویذ لئے ہوئے خدمت امام میں حاضر ہوئے۔ لیجئے سیدالشہداؑ مجبور ہوگئے۔ یتیم بھتیجے کو بھی مرنے کی اجازت دے دینا پڑی۔

انصاف کیجئے جب رخصت کے وقت حسینؑ کے قلب کی بے چینی کا یہ عالم تھا تو کیا حال ہوا ہوگا اُس وقت جب یہی عزیز بھتیجا جو نوشاہ بھی تھا زخمی ہوکر زمین پر گرا اور حسینؑ کو مدد کے لیے آواز دی۔ حسینؑ بھتیجے کی مدد کے لیے پہونچے اور شیر غضبناک کی طرح حملہ کیا۔

مجمع منتشر ہوا تو قاسم کی لاش سامنے نظر آئی اُس وقت امام کی زبان پر یہ نوحہ تھا کہ بڑا ناگوار ہے تیرے چچا پر یہ امر کہ تو اُسے پکارے اور وہ تیری خبر نہ لے سکے۔ یا تیری آواز پر آئے مگر تجھے کوئی فائدہ نہ پہونچا سکے۔

عزاداران حسینؑ! یہ سادیجیے قاسم کا اپنے دوسرے امام

امام حسنؑ کو بھی اور اپنے مظلوم آقا امام حسینؑ کو بھی پُرسا دیجئے۔ کیونکہ قاسمؑ کی شہادت سے دونوں گھروں کی بربادی ہوئی۔ بڑا صبر کیا جناب قاسمؑ کی مادر گرامی نے کہ اپنے نامراد کے قتل ہونے کی خبر سُن کر خیمہ سے نہیں نکل آئیں، یہ خاندان رسالت کی بی بیاں تھیں جن کے گھر سے پردہ نے رواج پایا تھا۔ بڑے بڑے سخت موقعوں پر اُنھوں نے پردہ کا لحاظ رکھا۔ مگر کیا کرتیں اُس وقت جب بعد شہادت حسینؑ دشمن خیموں میں ورانہ گھس آئے۔ اور بی بیوں کے سروں سے چادریں تک چھین لیں کیا کرتیں بی بیاں اور کس کو آواز دیتیں۔ علی اکبر اور عباسؑ جوان کے پردہ کے محافظ تھے موت کی نیند سو رہے تھے اور امام حسینؑ ایسے والی و وارث کا لاشہ زمین کربلا پر خاک و خون میں آلودہ پڑا تھا۔ زینب کہہ رہی تھیں لَیْتَ السَّمَاءَ اَطْبَقَتْ عَلَی الْاَرْضِ ۔ کاش آسمان زمین پر پھٹ پڑتا اور ہم کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوتا۔

مجلسِ ہشتم

محرم کی آٹھویں تاریخ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ اِنِّیْ لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَجُلًا کَرَّارًا غَیْرَ فَرَّارٍ یُحِبُّ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَ یُحِبُّہُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ

یہ وہ یادگار حدیث ہے جو ایک طرف تاریخ و سیر کے صفحات پر نمایاں حروف میں ثبت ہے تو دوسری طرف اہل ایمان کے دلوں پر نقش ہے۔ خیبر کا قلعہ مسلمانوں کی فوج کا محاصرہ، سرداروں کا پے درپے فوج لے کر جانا اور شکست کھا کر واپس آنا اور اس کے بعد رسولؐ کا فرمانا کہ کل میں اپنا علم اُس مرد میداں کو دوں گا جو پے در پے حملہ کرنے والا ہو اور میدان جنگ سے بھاگتا نہ ہو جو خدا و رسول کو دوست رکھتا ہے اور خدا و رسولؐ اُس کو دوست رکھتے ہیں۔

رسالتمآبؐ کے الفاظ کیا تھے ایک بیش قیمت تاج تھا جس کے

سر پر رکھنے کے لیے دلوں میں طوفان برپا ہو گیا۔ لوگوں کو پوری رات جاگتے بسر ہو گئی اس اشتیاق میں کہ کل ہمیں کو علم مل جائے۔ حالانکہ گذشتہ شکستوں کے بعد اُن لوگوں کو جو پہلے علم لیجا کر واپس آچکے تھے۔ دوبارہ امیدوار نہ ہونا چاہیئے تھا اس لیے کہ غیر فرار کی صفت لیے میدان چھوڑ کر چلے آنے والوں کے لیے گنجائش باقی نہ رکھی تھی مگر حسرت انھیں بھی تھی۔ ایک رسولؐ کا جاں نثار مجاہد اس جنگ میں موجود ہی نہ تھا۔ اس بنا پر کہ اُس کی آنکھیں رمد آلود تھیں اور وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور تھا۔ اس لیے ہر شخص کو یہ اطمینان تھا کہ ان الفاظ سے وہ مراد نہیں ہو سکتا مگر اس کو کیا کیا جائے کہ فضیلت اپنے مرکز کو خود تلاش کرتی ہے۔ اتنے بڑے مجمع میں رسولؐ کی نقاد آنکھوں کو ان تمام صفات کا جامع انسان نظر نہ آیا آخر حکم ہوا کہ بلاؤ علی بن ابی طالبؑ کو لوگوں نے جا کر آپ کو اطلاع دی اور آپ حاضر خدمت رسولؐ ہوئے۔ رسالتمابؐ نے آنکھوں میں لعاب دہن لگا کر آنکھوں کو نور دیا اور پھر ہاتھ میں علم دیدیا فرمایا جاؤ کفار سے جنگ کرو۔ علی بن ابی طالبؑ کی یہ علمداری یادگار رہے گی

سابقہ شکستوں کا غبار اور ذلت کی گرد جو بھر بھرے کے اوپر پڑ چکی تھی اس فتح مبین نے جھاڑ دی اور اسلام کے علم کو نمایاں ظفر حاصل ہوئی جنگ اُحد میں کفار کے علمداروں کو علی بن ابی طالب نے تہہ تیغ کیا مگر حالت یہ تھی کہ جو علمدار قتل ہوتا تھا فوراً دوسرا شخص اُس کی جگہ پر آ کر علم ہاتھ میں لے لیتا تھا۔

مشرکین کی کوشش یہ تھی کہ اُن کا علم سرنگوں نہ ہونے پائے اس لیے کہ علم کا گرنا فوج کی شکست کا نشان ہوتا ہے مگر علی بن ابی طالبؑ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور آپ نے اسلامی علم کے مقابلہ میں کفار کے جھنڈے کو پست کر دیا۔ پھر اس شان سے امیرالمومنینؑ نے ہر موقع پر رسولؐ کے علم کی عزت کو قائم رکھا کہ یہ منصب آپ سے مخصوص ہو گیا۔ یہاں تک کہ روز قیامت بھی رسالتمآبؐ کا علم علیؑ کے ہاتھ میں ہو گا خود حضرت رسولؐ نے ارشاد فرمایا عَلِیٌّ حَامِلُ لِوَائِی یَوْمَ الْقِیَامَةِ علیؑ ہی میرے علم کو اُٹھانے والے ہوں گے قیامت کے دن۔ خیال تو کیجئے کیا شان ہو گی۔ رسالتمآبؐ شاہی عظمت و شکوہ کے ساتھ آگے اور اُن کے ساتھ حضرت یعسوب الدین امیرالمومنین علی بن ابیطالبؑ

ؔ ارشاد شیخ مفید ص ۴۴ و ص ۵۵

علم کے پھر ہرے کو کھولے ہوے اور اُس علم کے نیچے شیعہ و محب اس طرح جیسے شمع کے گرد پروانے یا چاند کے گرد تارے۔ کاش ہمارا یہ مجمع بھی، اُس دن اُسی علم کے سایہ میں بہشت کی طرف جا رہا ہو۔ مگر یہ اُسی وقت ہوگا جب ہم حقیقتاً اُن کے گروہ میں داخل ہوں اور اُن کا گروہ ایسا کہ جسے وہ اپنی طرف منسوب کرنا پسند کریں وہی ہو سکتا ہے جو اپنے افعال اعمال کے لحاظ سے اُن کی طرف منسوب ہونے کے قابل ہو۔ ہم اگر اُس علم کے سایہ میں چلنا چاہتے ہیں تو ہمیں افعال و کردار کی اصلاح کرنا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس دن ہم اُس صف سے علیحدہ کر دیئے جائیں اور ہمارا شمار اغیار میں کیا جائے۔

یہ علی بن ابی طالبؑ کی علمداری کی شان تھی مگر یاد رکھئے کہ پھر بھی علمدار حضرت امیرؑ کا مخصوص لقب نہیں ہوگیا۔

یہ خصوصیت تو اُن کے فرزند ابوالفضل العباسؑ کی ہے۔ انھوں نے کچھ اس طرح آخر وقت تک علمداری کی کہ علمدار کی لفظ ہمیشہ کیلئے اُن کے واسطے مخصوص ہو گئی۔

علم سے فوج کی رونق ہوتی ہے اور ایک لشکر اُس وقت تک

موجود سمجھا جاتا ہی جب تک اُس کا پھریرا ہوا میں لہراتا ہو۔ اسی وجہ سے روز عاشور جب تک ایک آدمی بھی نصرت کرنے والا فوج حسینی میں موجود تھا اُس وقت تک حضرت نے عباس کو میدان جنگ میں نہیں بھیجا۔ مگر جب کوئی نہ رہا تو عباس خدمت میں حاضر ہوئے اور جنگ کی اجازت مانگی

امام نے اپنے بھائی کو حسرت کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا تم تو میرے علمدار ہو۔ عباس نے عرض کیا کہ اب مجھ سے تحمل ممکن نہیں اور زندگی سے سیر ہو گیا ہوں۔ امام نے فرمایا کہ اچھا جاتے ہو تو پانی کی فکر کرنا۔

جناب عباس نے مشک لے لی اور میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئے قمر بنی ہاشم کی یہ شجاعت یادگار ہے کہ ایک اکیلے فرات کی محافظ فوج کو جنگ کرکے بھگا دیا۔ اور اتنی دور ہٹا دیا کہ اطمینان کے ساتھ نہر میں گھوڑا ڈالا اور پانی مشک میں بھرا۔

بے شک خود جناب عباس پیاسے تھے اور اس جنگ میں پیاس نے غلبہ کیا ہوگا۔ ممکن ہی کچھ زخم بھی آگئے ہوں مگر واہ ری عباس کی وفاداری پانی ہاتھ میں لے کر پھینک دیا اور خیال کیا کہ میرے امام تو تین دن کے پیاسے ہوں اور میں اپنے لب پانی سے تر کرلوں۔ پیاسے ہی نہر سے

نکل آئے اور بھری ہوئی مشک دوش پر لیے خیام حُسینی کی طرف روانہ ہوئے۔ فوج عمر سعد کو اپنی شکست کا غصہ تھا اور یہ کد بھی تھی کہ پانی حسین تک کہیں پہونچنے نہ پائے۔

اور حقیقت بھی یہ ہے کہ یہ سب سے بڑا حربہ تھا جو بہادر امام کے خلاف استعمال کیا گیا۔ اگر حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں کو پانی مل جاتا تو شاید کربلا کا تاریخی واقعہ اس طرح نہ ہوتا جو اب ہوا۔

فوج عمر سعد نے عباسؑ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس مجمع کی جانیں نثار عباسؑ کی شجاعت پر۔ کاش یہ مجمع اُس وقت ہوتا اور عباس کی اس سخت وقت میں کچھ مدد کر سکتا۔

اس وقت عباس کے دوش پر مشک تھی اور یقیناً علم بھی کاندھے پر موجود ہوگا۔ بھلا کوئی بہادر اس عالم میں کبھی لڑا ہے مگر واہ ری شجاعت عباسؑ اُنھوں نے اس عالم میں جنگ شروع کر دی اور وہ رجز پڑھ رہے تھے جس کا مضمون یہ تھا کہ میں کبھی موت سے نہیں ڈرتا۔ موت کتنے ہی نعرے لگائے جب تک میں تلواروں کے سایہ میں زمین پر نہ گر جاؤں میں عباسؑ ہوں۔ مشک لیجاؤں گا اور ضرور لے جاؤں گا اور جنگ کے ہنگام

میں موت کی کوئی پرواہ نہ کروں گا۔"

دشمنوں نے سمجھ لیا کہ جب تک عباسؑ کے ہاتھ موجود ہیں ان کا مقابلہ کرنا غیر ممکن ہے۔ لیجیئے غضب ہو گیا ایک شقی نے عباسؑ کے داہنے ہاتھ پر تلوار ماردی۔ جناب عباسؑ کو اپنی جان سے زیادہ علم کا خیال تھا اُنھوں نے علم کو گرنے نہیں دیا۔ بائیں شانہ پر لے لیا مگر ابھی کچھ دیر نہ گذری تھی کہ دوسرے شقی نے بائیں ہاتھ پر تلوار لگائی یہ ہاتھ بھی عباس کا قطع ہو گیا مگر واہ رے عباس آپ نے علم کو اپنے سینہ سے لگا لیا۔ اب بڑا غضب ہوا ایک شخص نے سر پر ایک گرز لگایا عزادارانِ حسینؑ اب عباسؑ مجبور ہیں پیغمبر کا علم ٹھنڈا ہوتا ہے۔

حضرت عباس گھوڑے سے زمین پر گرے امام کو آواز دی کہ میری خبر لیجیئے۔ امام پر اس آواز کا بڑا اثر ہوا آپ جلدی لاش پر گئے۔ دیکھا دونوں ہاتھ قطع ہیں پیشانی شکستہ ہے آنکھ پر تیر ہے۔ زخموں سے چور ہیں۔ امام جھک گئے اور سرہانے بیٹھے بھائی کی جاں کنی کا عالم دیکھتے رہے۔ کون تھا؟ جو حسینؑ کا اس وقت ساتھ دیتا۔ حسینؑ دیکھتے رہے اور عباس کی روح

نے جدے مفارقت کی ۔

امام لاش کے پاس سے اُٹھے اس طرح کہ کمر شکستہ ہو چکی تھی۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ فرماتے تھے اَلْآنَ اِنْکَسَرَ ظَهْرِیْ وَقَلَّتْ حِیْلَتِیْ اے بھائی عباس تمھارے مرنے سے کمر حسینؑ کی ٹوٹ گئی اور راہ چارہ و تدبیر مسدود ہو گئی۔

مجلسِ نہم ۹

محرّم کی نویں تاریخ

تَاسُوْعَا یَوْمٌ حُوصِرَ فِیْہِ الْحُسَیْنُ ؑ

نویں محرم وہ قیامت خیز تاریخ ہی جس میں حسینؑ چاروں طرف سے نرغۂ اعدا میں گھر گئے۔

کتنی فوج تھی؟ بھلا اس کو کہاں بتایا جا سکتا ہی۔ یہ سمجھ لیجئے کہ ابن زیاد کی طرف سے اس کا اہتمام تھا کہ کوئی لڑنے والا سپاہی کوفہ کے اندر باقی نہ رہ جائے۔ یقیناً کربلا کی زمین فوج کی کثرت سے سمندر کی طرح موجیں مار رہی تھی اور یہ کس کے مقابلہ کی تیاری تھی۔ حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں کی۔ جن کی تعداد مشکل سے سَو سے زیادہ ہوگی

پھر اس پر طرّہ یہ کہ فرزند رسولؐ اور اُن کے اصحاب انصار یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے اوپر پانی بھی بند کر دیا گیا عرب کا ریگستان اور تپتی ہوئی ریگ اور اُس پر خیام حسینی میں

کمسن بچے اور ساتویں سے پانی بند۔ آپ ہی انصاف کیجئے کہ آج نویں تاریخ تک اُن کے پیاس کی طغیانی کا کیا عالم ہوگا۔

آج فوج دشمن سے صلح کی امیدیں بھی ختم ہو چکی ہیں۔ شمر کوفہ سے ابن زیاد کا خط لے کر کربلا پہونچ گیا ہے۔ کیا بتاؤں اس خط میں کیا لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

اگر حسینؑ اپنے تئیں میرے سپرد کر دیں تو خیر نہیں تو فوراً اُن پر حملہ کر کے اُنھیں قتل کر دے۔ اسی پر اکتفا نہیں ہوی۔ آپ کو معلوم ہے کہ عرب میں جس کی توہین انتہا کی منظور ہوتی ہے اُس کی لاش کو مُثلہ کیا جاتا ہے یعنی اُس کے اعضاء کو جدا کیا جاتا ہے۔

ظالم ابن زیاد لکھا ہے کہ دیکھو قتل کے بعد حسینؑ کی لاش کو مثلہ کرنا اور اُن کی لاش پر گھوڑے دوڑانا حسینؑ اسی کے مستحق ہیں۔

کیا میں یاد دلاؤں کہ اس حکم کی تعمیل بعد شہادت حسینؑ کس طرح ہوی۔ امام کا یہ فقرہ زیارت کا پڑھ لیجئے کہ

اَلسَّلَامُ عَلَى الْاَعْضَاءِ الْمُقَطَّعَاتِ

"سلام ہو اُن اعضاء پر جو ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے"

یہ خط عمر سعد کو پہونچ گیا نویں تاریخ کی شام نہیں ہونے پائی تھی، کہ عمر سعد نے جنگ کی تیاری کر دی اور امام پر حملہ کا حکم دے دیا۔

امام عصر کے وقت تھے خیمہ مبارک کے دروازہ پر تلوار کا سہارا لئے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھے تھے اور کچھ نیند غالب ہوگئی تھی کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز جناب زینب کے کان میں گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس بہن کو اپنے بھائی سے کس درجہ محبت تھی حضرت زینب بیتابانہ امام حسین کے قریب آئیں اور کہا بھائی! بھائی!! دیکھیے دشمن کے لشکر کی آواز بہت قریب سے آرہی ہے حضرت نے سر اُٹھایا فرمایا ابھی میں نے رسالتمآبؐ کو خواب میں دیکھا کہ حضرت فرماتے ہیں تم عنقریب ہمارے پاس آیا چاہتے ہو یہ سُننا تھا کہ زینب نے واویلا کہا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا منھ پیٹ لیا۔ امام نے تسکین دی اور صبر و سکون کی ہدایت فرمائی۔

جناب زینب امام ہی کی زبان سے یہ خواب سننے کی تاب لا سکیں کیا یہ وہی زینب ہیں جنھیں بعد عصر قتل الحسینؑ کی آواز سُنائی دیتی ہیں۔ اور خیمہ کے دروازہ پہ گھوڑا حسینؑ کا خالی اسی

شان سے آرہا ہے کہ باگیں کٹی ہوئی، جابجا تیر پیوست اور پیشانی خون سے رنگین۔ یہ گھوڑا بہن کو بھائی کی شہادت کی خبر دیتا ہے۔ زینب جب خیمہ سے نکلیں تو باجے فتح کے بج رہے تھے۔ سر حسین ع نوک نیزہ پر تھا زینب کہہ رہی تھیں۔

لَيْتَ السَّمَاءَ اَطْبَقَتْ عَلَى الْاَرْضِ۔ کاش آج آسمان پھٹ کر زمین پر گر پڑتا۔ کبھی رسولؐ سے خطاب کر کے کہتی تھیں یَا جَدَّاہ صَلّٰى عَلَيْكَ مَلِيْكُ السَّمَاءِ وَهٰذَا الْحُسَيْنُ مُرَمَّلٌ بِالدِّمَاءِ مُقَطَّعُ الْاَعْضَاءِ۔ اے نانا! اے رسول خدا! آپ پر آسمان کے ملائکہ درود وسلام بھیجیں اور یہ آپ کا فرزند حسینؑ زمین گرم کربلا پر ہے اس طرح کہ جسم خون سے رنگین ہے اور اعضا ٹکڑے ٹکڑے ہیں ؎

اجرکم علی اللہ۔ امام نے جناب عباسؑ کو حکم دیا کہ ان کے پاس جاؤ اور اس وقت کے حملے کا سبب دریافت کرو۔ جناب عباس گئے اور واپس آکر عرض کیا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ امیر ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ یا حسینؑ بیعت کریں اور یا پھر اُن سے جنگ کی جائے۔ حضرت نے فرمایا جاؤ اور اُن سے ایک شب کی مہلت مانگو۔ حضرت عباسؑ نے

جاکر پیغام امام کا پہونچایا۔ عمر سعد نے پہلے تو انکار کر دیا مگر پھر اُسی فوج والوں کے اصرار سے مجبور ہوا۔ مہلت دیدی۔

بس یہ ایک شب اور حسینؑ دنیا میں مہمان ہیں اور ہمارے عزاخانوں میں تو آج ہی آخری مجلس ہے سمجھیے کہ آج ہی امام رخصت ہو رہے ہیں اس کے بعد یہ رونق عزاداری کی نہ رہے گی۔ پھر سال بھر جو زندہ رہے گا امام کی عزاداری آئندہ عشرۂ محرم میں کرے گا۔

اچھا سُنئے آج کی شب امام نے کیونکر بسر کی۔ یہ تمام شب امام اور اُن کے اصحاب نے عبادت خدا میں بسر کی۔ راوی کا بیان ہے کہ لَهُمْ دَوِیٌّ کَدَوِیِّ النَّحْلِ ان کی آوازیں تسبیح و تہلیل سے اس رات کے سناٹے میں یوں گونج رہی تھیں جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے آواز آتی ہے حضرت نے اس شب اپنے اصحاب پر اتمام حجت بھی فرمائی اور اُن کی وفاداری کا امتحان لیا۔ یادگار ہے وہ موقع کہ آپ نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع فرمایا۔ امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں کہ میں بیمار تھا مگر قریب چلا گیا کہ سنوں امام کیا فرماتے ہیں آپ نے ایک خطبۂ فصیح پڑھا اور ارشاد فرمایا کہ میں نہیں جانتا کسی کے اصحاب کو جو میرے اصحاب سے زیادہ

باوفا ہوں اور نہ کسی کے عزیزوں کو جانتا ہوں جو میرے عزیزوں سے زیادہ اطاعت شعار ہوں خدا تم کو میری طرف سے جزائے خیر عطا کرے معلوم ہونا چاہیے کہ کل کا دن فیصلہ کن ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم سب لوگ چلے جاؤ خوشی کے ساتھ۔ میری جانب سے تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ رات تاریک ہے اس کو غنیمت سمجھو اور یہاں سے جلدی نکل جاؤ

اس کے بعد آپ نے عجیب حسرت کا کلمہ فرمایا۔ کہا میرا مطلب اس سے یہ بھی ہے کہ تم میں سے ہر ایک میرے ایک ایک عزیز کا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ لیتا جائے۔ کہ میری جان تو جائے ہی گی یہ لوگ کسی طرح محفوظ رہیں۔

یہ سننا تھا کہ پورے مجمع میں بے چینی پیدا ہوگئی مگر اصحاب و انصار پاس ادب سے خاموش رہے۔ سب سے پہلے جس کی آواز بلند ہوئی وہ قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباسؑ تھے اور آپ کے ساتھ سب بھائیوں بھتیجوں اور دوسرے عزیزوں نے کہا کہ کیوں یہ ہم کس لیے کریں؟ کیا اس لیے کہ ہم آپ کے بعد زندہ رہیں؟ خدا ہم کو یہ روز بد نصیب نہ کرے۔

اعزا کے بعد اصحاب کی باری آئی۔ سب سے پہلے بوڑھا مجاہد مسلم بن عوسجہ کھڑا ہوا۔ آپ نے رُخ کیا امام کی طرف اور کہا بھلا ہم آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ خدا کی قسم میں ان دشمنوں سے نیزہ کے ساتھ جنگ کروں گا یہاں تک کہ میرا نیزہ اُن کے سینوں میں ٹوٹ جائے اور تلوار لگاؤں گا جب تک کہ اُس کا قبضہ میرے ہاتھ میں ٹھہر سکے اور میں آپ کسی طرح جدا نہ ہوں گا۔ اگر ہتھیار نہ ہوں گے تو میں انہیں پتھر ماروں گا اور آپ کی حمایت کروں گا یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر اس جان کو نثار کر دوں۔ اسی طرح کی تقریریں دوسرے مجاہدین نے کیں۔

میں مسلم بن عوسجہ کو مبارکباد دیتا ہوں اُن کے عزم وارادہ پر مگر میں کہوں گا کہ آپ کی جرأت و شجاعت ایسی نہ تھی کہ کبھی آپ کے ہاتھ سے تلوار کا قبضہ جدا ہو جائے۔ آپ کو یہ نوبت نہیں آئی کہ آپ اپنے دشمنوں پر پتھروں سے حملہ کریں مگر آپ کے آقا حسینؑ پر ہر طرح کے حربے لگائے گئے۔ تلوار، تیر اور نیزے ہی کیا کم تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ اشقیا جھولیوں میں پتھر بھرے ہوئے تھے اور امام کی جانب پھینک رہے تھے

عصر عاشورا کا وقت تھا اس وقت جب امام زخموں سے چور ہو چکے تھے کہ ایک پتھر ایسا آیا جو حضرت کی پیشانی پر لگا جس سے خون جاری ہوا اور چہرے پر آ گیا۔ امام نے قبا کے دامن کو اٹھا کر چاہا کہ خون پیشانی سے پاک کریں۔ اس وقت ایک تیر ایسا آیا جو قلب مبارک پر لگا۔ امام نے اس تیر کو پشت کی طرف سے نکالا جس سے خون مثل پرنالے کے جاری ہوا اس نے امام کی تمام قوت ختم کر دی۔ اس کے بعد زبان میں طاقت نہیں۔ ایک شعر ایسا لکھا ہے

سے

بلند مرتبہ شاہے ز صدر زیں افتاد

اگر غلط نہ کنم عرش بر زمیں افتاد

امام پر پتھروں سے حملہ کی انتہا آپ کی زندگی پر بھی نہ ہوئی بعد شہادت کیا یاد دلاؤں۔ کوفہ کا بازار ایک مکان کا بر آمدہ، سنگ جفا اور حسین مظلوم کا سر۔ چاہنے والی بہن سامنے دیکھ رہی تھی۔ زینب نے اپنا سر چوب محمل پر دے مارا۔ اس طرح کہ خون جاری ہو گیا کہتی تھیں اے چاند میرے امام کے ابھی تو تو کمال کو بھی نہ پہنچا تھا کہ کس قدر جلد گہن لگ گیا

(ختم)

مجلسِ دہم ۱۰

محرم کی دسویں تاریخ

بِاَبِی الْمُسْتَضْعَفِ الْغَرِیْبِ بِلَا نَاصِرٍ۔

"میرا باپ فدا اُس غریب و بیکس پر جو کربلا میں بے یار و مددگار رہ گیا تھا"

دنیا حسینؑ سے پھر گئی تھی۔ ایک فرزند رسولؐ کے قتل کے لیے ہزاروں تلواریں کھنچی ہوئی تھیں۔ اس ایک رات کی مہلت ہی بہت مشکل سے دی گئی تھی۔ عاشور کی صبح قیامت کی صبح تھی۔ بی بیاں اپنے وارثوں کی زندگی سے ناامید ہو چکی تھیں۔ مائیں اپنے بچوں کے چہرہ کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہی ہوں گی۔ کہتی ہوں گی کہ تھوڑی دیر میں یہ چاند سی صورتیں خاک میں مل جائیں گی۔

امام نے اپنے اصحاب کے ساتھ نماز صبح بجماعت ادا کی اور رسولؐ زادے کے قتل کی تیاری کرنے والے بھی اپنے تئیں مسلمان سمجھ رہے تھے۔ اس لیے انھوں نے بھی نماز صبح پڑھی۔ مگر اس کے بعد بانی اسلام کے فرزند کا

خون بہانے میدان میں آگئے۔

فوج مخالف میں صف بندی ہوئی اور امام حسینؑ نے بھی اپنے چھوٹے سے لشکر کو ترتیب دیا۔ میمنہ پر زہیر بن قین۔ میسرہ پر حبیب بن مظاہر اور علم فوج کا اپنے بھائی قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباسؑ کو دیا۔

اس کے پہلے امام ہر طرح سے اتمام حجت کر چکے تھے مگر پھر آخری مرتبہ حضرت نے حجت تمام کر دینا چاہی۔ آپ نے ایک ناقہ طلب فرمایا اُس پر سوار ہوئے۔ قرآن منگا کر اپنے سامنے رکھا اور صفوف دشمن کے سامنے آکر ایک فصیح و بلیغ تقریر شروع کی۔ امام کی آواز جو خیمہ میں پہونچی تو اہل حرم سے گریہ کا شور بلند ہوا۔ حضرت نے جناب عباسؑ و علی اکبر کو بھیجا کہ انھیں خاموش کرو۔ رونے کا وقت تو اس کے بعد آئے گا۔

میں عرض کرونگا اے آقا جتنا رو ئیں رو لینے دیجئے۔ اس کے بعد تو پھر ان بیکسوں کو رونے کا موقع بھی نہ دیا جائے گا۔ ظلم و ستم کی انتہا ہوگی کہ جب کسی کے آنکھ سے آنسو نکلے گا تو اُس کو نوک نیزہ سے اذیت دی جائے گی۔

امام کے موعظہ کا فوج مخالف پر کوئی اثر نہ ہوا۔ امام نے قرآن

ہاتھوں پہ لے کر گویا یہ بتلایا کہ قرآن میرے ساتھ ہے۔ ابھی ان ہاتھوں پر دشمن کی فوج کے سامنے قرآن بلند ہو رہا ہے۔ نہ سہی اس کا اثر مگر غنیمت ہی کہ قرآن کے اوپر کوئی تیر نہیں لگایا جاتا۔ مگر آج ہی عصر کے پہلے وہ وقت آیا جب امام نے ان ہی ہاتھوں پر قرآن ناطق کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بلند کیا۔ کون؟ وہ بے زبان معصوم بچہ جو پیاس سے جاں بلب تھا۔ حرملہ سے یہ دیکھا نہ گیا۔ چلّہ کمان میں ایک تیر جوڑ کر لگایا جو بچہ کے گلے پر لگا۔ اور معصوم آغوش پدر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

امام کی تقریر کا فوج مخالف نے کوئی اثر نہ لیا۔ دھوپ چڑھ گئی تھی دن کا تھوڑا عرصہ گذر گیا تھا۔ جب عمر سعد نے تیر چلّہ کمان میں جوڑا اور لشکر امام کی طرف رہا کیا۔ پکار کر کہنے لگا گواہ رہنا کہ سب سے پہلا تیر حسینؑ کی طرف میں نے ہی لگایا ہے۔ اس کے ساتھ ہزاروں تیر ایک ساتھ رہا ہو گئے بس سمجھ لیجیے کہ یہی تیر تھا جس میں کربلا کے تمام مظالم مضمر تھے۔ امام کے مقابلہ میں کربلا میں تیروں کا بڑا استعمال کیا گیا۔ یوں تو ہزاروں ہی تیر پھینکے گئے۔ مگر واقعۂ کربلا میں چند تیر یادگار ہیں

پہلا وہی تیر جس نے رباب کی گود خالی کی۔

امام نے بے شیر کا خون اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور چلّو آسمان کی طرف پھینکا اور کہا جو کچھ خدا کی راہ میں مجھ پر گذرے سب آسان ہے۔

دوسرا تیر وہ تھا جب امام خود تین دن کی بھوک پیاس میں مصروف جہاد تھے۔ دل پہ بہتّر داغ۔ کمر عباسؑ کے مرنے سے شکستہ آنکھوں کا نور علی اکبر کے ساتھ رخصت ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی حسینؑ میدان جنگ میں علیؑ بن ابی طالب کی شان سے جہاد کر رہے تھے۔ اُس وقت ایک تیر آیا جو آپ کے حلقوم پر لگا۔ امام نے تیر کو کھینچ کر پھینکا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ حلقوم کے نیچے لگا دیئے۔ جب وہ بھر گئے تو اُسے بھی آسمان کی جانب پھینک دیا۔

عزادارانِ حسین! وقت سخت ہوتا جاتا ہے۔

تیسرا تیر وہ تھا کہ جب تمھارے امام کا جسم زخموں سے چور ہو چکا ہے۔ یہ تیر امام کے قلب مبارک پر لگا۔ جس کو حضرت نے پشت کی طرف سے کھینچا۔

روایت میں یہ فقرہ وارد ہے کہ فَانبَعَثَ الدَّمُ کَالمِیزَاب
"خون اس طرح جاری ہوا جیسے پرنالہ سے پانی بہتا ہے"
یہ خون کیا بہا کہ امام کی طاقت سلب ہوگئی۔ افسوس اس
پر اکتفا نہ ہوئی صالح بن وہب نے ایک نیزہ کمر پر لگایا جس کے صدمہ
سے امام زمین پر تشریف لائے۔ دشمنوں کے حملے اس وقت بھی
برابر جاری تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب عبداللہ بن حسنؑ خیمہ سے نکلے
دس گیارہ برس کا سن، بھولی بھولی صورت۔ جناب اُمّ کلثوم نے
روکنا بھی چاہا مگر بچہ نے کسی طرح نہ مانا۔ اور کہا خدا کی قسم میں اس
حال میں اپنے چچا کو تنہا نہ چھوڑوں گا پہونچ گئے امام کے قریب،
ابحر بن کعب شقی تلوار لگانا چاہتا تھا۔ عبداللہ نے بڑھ کر کہا:۔
"ارے کیا میرے چچا کو قتل کرے گا؟" اُس شقی نے کوئی پرواہ
نہ کی۔ بچہ نے اپنا ہاتھ اٹھا دیا تلوار ہاتھ پر پڑی اور اُسے
جلد تک کاٹ دیا۔ بچہ نے آواز دی یَا اُمَّاہُ "ہائے
میری ماں دیکھئے کیا ہوا" امام نے بچہ کو گلے سے لگایا
اور اسی حالت میں عبداللہ کی روح نے جسم سے مفارقت کی۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ سمجھ لیجئے کہ پنجتن کا خاتمہ ہو گیا۔ سکینہ یتیم ہو گئیں زینب بن بھائی کی اور شیعہ بے امام کے ہو گئے۔ فتح کے نقارے بج رہے تھے اور ایک غل تھا:-

قَدْ قُتِلَ الْحُسَیْنُ قَدْ ذُبِحَ الْحُسَیْنُ